ویران
پڑے
ہیں
راستے
جاوید عارف

ویران
پڑے
ہیں
راستے

ہنستا چہرہ روشن آنکھیں باتیں ہیں دل والوں کی
عارف ہم پہ کیا بیتی ہے کب سمجھیں فرزانے لوگ

ویراں پڑے ہیں راستے

جاوید عارف

19 75

بزمِ مولا شاہ (سائیں مولا شاہ ویلفیئر سوسائٹی)
41-A چوہان روڈ اسلامپورہ لاہور

مُحسن و مربی

والدِ گرامی قدر

عبدالرؤف صوفی رحمۃ اللہ علیہ

کے نام

جنہوں نے انتھک محنت اور جدوجہد سے

ہم بہن بھائیوں کی پرورش کی

اور

نامساعد حالات میں بھی زندگی کرنے کی خوبخشی

O

سب ہی عارفؔ کی کہانی شوق سے سنتے رہے
ہم کو ساری داستاں میں ان کہی اچھی لگی

شاخیں

حصۂ نظم

ویران راستوں کا مسافر ـــــــ جاوید عارف

"ویراں پڑے ہیں راستے" جاوید عارف کے احساسات کا شاعرانہ اظہار ہے اس میں راستوں کے ویران ہو جانے کا کرب بھی ہے اور راستوں کو آباد کرنے کی آرزو بھی انگڑائیاں لے رہی ہے۔ کہنے کو تو راستوں کی کمی نہیں ہے، راستوں پر اُمڈا ہوا ہجوم بھی بھاگتا دوڑتا دکھائی دیتا ہے۔ راستے پھر کیسے ویران ہیں؟ اور کیسے آباد ہوں گے؟ ان سوالوں کو شاعر کی محسوسات کے حوالے سے دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ شاعر نے احساس کی سطح سے اپنے خیالات کو ترتیب دیا ہے۔ فرد کی تنہائی، تنہائی کا کرب، معاشرتی بیگانگی، سماجی ٹوٹ پھوٹ، اقدار کی پامالی، محنت کی بے وقعتی، محبت کی رسوائی، حالات کا جبر، ہجرتوں کی مجبوری ایسی بہت سی باتیں ہیں جو اسے اظہار پر اُکساتی ہیں۔ ان ہی سے جاوید عارف کا شعری مزاج ترتیب پاتا ہے۔

جاوید عارف ادبی ماحول سے الگ تھلگ حالات کے بہاؤ میں بہہ کر دیس دیس رزق کی تلاش میں گھومنے پھرنے والا شاعر ہے۔ اُس کی اس مسافرت نے ہی شاید اُسے شاعرانہ فنی تربیت سے دور رکھا ہے مگر یہی دیس نوردی اور گھر سے دُوری اسے شاعری کا وصف بھی عطا کرتی ہے۔ ٹھیک بات ہے کہ اس کے اشعار میں اہلِ فن کو کہیں کہیں کمی سی محسوس ہوگی پھر بھی اظہار کی سادگی اور سچائی، مشاہدے کی وسعت، معاشرے کے کرب کو ذات میں سمو لینے اور ذات کے کرب کو جامۂ اظہار پہنانے کی کوشش اسے ایک انفرادیت دیتی ہے۔ یہی انفرادیت ہر نئی آواز کا خاصا ہوتی ہے۔

جاوید عارف کی شاعری روایت سے جُڑی ہوئی ہے۔ اس کے ہاں محبت کے

معاملات، ہجر و وصال کی کیفیات، حسن و ادا کے تذکرے اس کی روایت پسندی کی گواہی دیتے ہیں۔ پھر بھی اس کی شاعری محض روایتی شاعری نہیں ہے۔ ہاں! روایت کو ساتھ لے کر ذات کی ہمرہی میں آگے بڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یوں مضامین پیدا نہیں کیے جاتے، موجود ہوتے ہیں اور انتہائی سادہ لب و لہجے میں بیان ہوتے ہیں۔ ان مضامین میں ذاتی تجربات کا رنگ ایک نیا فن اور حسن پیدا کرتا ہے۔

سچائی نعرۂ مستانہ بھی ہے، جرأتِ رندانہ بھی ہے۔ جہاں یہ فرد کو ہمت و توانائی دیتی ہے وہیں کرب و تنہائی کا باعث بھی ٹھہرتی ہے۔ یہاں تو سماعتوں پر سننا بھی گراں گزرتا ہے۔ سچ پر استقامت اختیار کر لینا آسان نہیں ہوتا۔ جاوید عارف یہ کٹھن کام کرنے کی دُھن رکھتا ہے تبھی تو وہ کہتا ہے :

میں گھرے اندھیروں میں سچ بولتا ہوں
میں دھندلے سویروں میں سچ بولتا ہوں
غمِ دل ، غمِ جاں، غمِ جانِ جاناں
میں ان غم کے ڈھیروں میں سچ بولتا ہوں
یہاں پارسا ہیں ، یہاں سب خدا ہیں
میں ان سب کے گھیروں میں سچ بولتا ہوں
ہوں منصور مجھ کو بھی سولی چڑھا دو
میں شعروں اُکیروں میں سچ بولتا ہوں

وہ اس بات کو مزید بڑھاوا دیتے ہوئے یوں بھی کہتا دکھائی دیتا ہے :

سچ کا ملنا مشکل ہے
تو بھی کتنا پاگل ہے

سچائی کی انگلی پکڑ کر چلنے والے کے لیے ذات سے کائنات تک دُکھ اور کرب کا ساتھ ہوتا ہے۔ زندگی کے تمام راستے کرب کے کانٹوں سے بھر جاتے ہیں۔ کرب کبھی ذات کا ہوتا ہے، کبھی معاشرے کا تو کبھی معاشرتی رویوں کا، ہجرتوں کا کرب، محبوب کی بے وفائی کا کرب، اپنی بے بسی کا کرب، یوں چاروں طرف زندگی کے ہر ہر راستے پر ایک کرب ناک ماحول آسیب کی طرح پھیل جاتا ہے جو لمحہ لمحہ زہر کے گھونٹ پلاتا ہے اور خون کے آنسو رُلاتا ہے۔ مگر شاعر کا مزاج ہے کہ اسی میں زندگی کرنی ہے، یہیں سے سچائیوں کا راستہ نکالنا ہے جو خوشی کی منزل تک جاتا ہے۔ جاوید عارف کے ہاں کرب اپنی تمام تر جہتوں کے ساتھ موجود ہے :

دل کو توڑو جشن مناؤ
ناچو ، گاؤ ، کھیل رچاؤ
کوئی رشتہ رکھو مجھ سے
میرے دشمن ہی بن جاؤ

یا پھر یوں کہ :

ٹوٹ کر آنکھوں سے تارا گر گیا
آسمانوں پر ستارے کم نہ تھے

○

زندگی سِسکتی ملے ہر دم
لوگ مُردوں سے پیار کرتے ہیں

شاعر کا کرب صرف اس کی ذات تک محدود نہیں ہے۔ وہ پورے معاشرے کے کرب کو محسوس کرتا ہے اور کُڑھتا ہے :

وہ دیکھو مفلسی سے مر رہا ہے
جو اپنی ذات میں اک شہنشاہ ہے
یہ پھر کس پر ستم ٹوٹا ہے یا رب
یہ کس آفت رسیدہ کی صدا ہے
مجھے احساسِ محرومی دیا کیوں؟
مجھے بس تجھ سے یارب یہ گلہ ہے

دوسروں کے دُکھ کا احساس جب اُسے کرب میں مبتلا کرتا ہے تو وہ خود سے یوں ہم کلام ہوتا ہے:

رنج والم میں ڈوبے چناروں کی بات کر
اک تو ہی تو نہیں ہے ہزاروں کی بات کر

محرومی کا کرب جب اسے اپنے دیس میں پریشان کرتا اور ڈستا ہے تو اس کے دل میں چُھپی وطن کی محبت اسے یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے :

اب کے برس بھی دیس میں گُل ہی نہیں کھلے
چل اجنبی سے دیس دیاروں کی بات کر

○

چھوڑ کر جا تو رہا ہوں میں تیرا شہر ندیم
جانتا ہوں کہ مجھے خود سے بچھڑنا ہوگا

تنہائی کرب کی پرورش کرتی ہے اور پھر تنہائی بذاتِ خود ایک بہت بڑے کرب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ آج کے معاشرے میں فرد کی تنہائی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ مزید برآں فاصلوں نے ایک بیگانگی پیدا کر دی ہے۔ آج ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ہر فرد ریشم کے کیڑے

کی طرح اپنے گرد ریشم بُن رہا ہے اور اس ہوس ناک ماحول میں اپنے لئے آپ ہی تنہائی تعمیر کر رہا ہے۔ یہ تنہائی جب اسے بے چین کرتی ہے، اس وقت تک واپسی کے راستے مسدود ہو چکے ہوتے ہیں۔ یوں گھٹ گھٹ کے مرنا اس کا مقدر ٹھہرتا ہے۔ اس کی آنکھیں بے خواب ہو جاتی ہیں، انتظار میں پتھرا جاتی ہیں اور اسی انتظار کی کیفیت میں بے نور ہو جاتی ہیں :

اس زمانے میں کہاں انسان ہے
جو بھی ملتا ہے وہی بھگوان ہے
کشمکش ، بے چارگی اور بے بسی
زندگی کا بس یہی عنوان ہے

○

ایسی تنہائی کہ اپنے سے بھی ڈر لگتا ہے
ہر طرف دور تلک گھر ہیں مزاروں جیسے

○

کسی غمگیں کہانی کا کوئی کردار لگتا ہے
جسے دیکھو وہی خود سے ہمیں بیزار لگتا ہے
غمِ دل ہے، غمِ جاں ہے، غمِ دُنیا، غمِ جاناں
جو دیکھوں عمرِ رفتہ کو تو اک اخبار لگتا ہے

کرب کی کیفیتیں حالات کے جبر میں ڈھل جائیں تو محبت کے خوابوں کی کھیتیاں اُجڑ جاتی ہیں۔ غم واندوہ کی حالت میں محبت اور محبوب ہی تو ایک ڈھارس ہوتی ہے۔ یہ سہارا بھی حالات کے جبر کی نذر ہو جائے تو بیچارگی و بےبسی دیدنی ہوتی ہے۔ شاعر نے رنج والم کے

یہ ذائقے بھی چکھے ہیں :

ترچھی نظروں سے جگر چیر کے جانے والا
کیسا انداز ہے ظالم کا ستانے والا
مجھ کو حالات نے دیوار میں چُن رکھا تھا
دوسرا ڈھونڈ لیا اُس نے بھی چاہنے والا

جاوید عارف ایسی اُداس اور سوگوار کیفیات کا ہی شاعر نہیں ہے۔ وہ جہاں غم کے گھاؤ دکھاتا ہے وہاں علاجِ غم سے پوری طرح آشنا ہے۔ وہ صرف بے بسی کا مزار ہو کر نہیں رہ جاتا۔ غم واندوہ، رنج وکرب میں سے بھی توانائی حاصل کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ وہ بے عملی اور مایوسی کا شکار نہیں ہوتا بلکہ ایسی دردیلی حالتوں میں بھی عزم و یقین سے اور جدو جہد کے جذبے سے سرشار دکھائی دیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مسائل کا حل رونے دھونے میں نہیں ہے۔ حالات کو بدلنے میں ہے۔ حالات کو بدلنے کی خواہش جس محنت کا تقاضا کرتی ہے وہ اسے بخوشی اختیار کرتا ہے :

ہوا کے رُخ کے مخالف دیا جلانا ہے
وگرنہ بات وہی ہے وہی فسانہ ہے

O

آنسوؤں سے چہرے کو دھونا نہیں
وقت کی گردش میں اب کھونا نہیں
خواہشِ فصلِ گُلِ تر خوب ہے
کاٹنا کیسا اگر بونا نہیں

○

خود کو عارفؔ جی سمیٹو کہ یہ دل پاگل ہے
بھول مت جانا کڑی دھوپ میں محنت کرنا

جاوید عارف کی زندگی کے ماہ و سال کو دیکھیں تو مسلسل جد و جہد اور انتھک محنت سے عبارت ہیں۔ اس نے جو کچھ حاصل کیا اُس کے لیے محنت اور صلاحیت کو ہی ذریعہ بنایا۔ اس کی عمل پسند زندگی کا اظہار ان اشعار سے بخوبی ہوتا ہے۔

ملا ہے مخملوں کا کب بچھونا
ہمارا کام ہے سڑکوں پہ سونا
یہ تاریخِ محبت کہہ رہی ہے
محبت کیا ہے؟ بس برباد ہونا

○

یا تو خود گھونسلا جلا ڈالو
شام ہوتے ہی ورنہ گھر جاؤ
حکم لکھا تھا ہاتھ پر عارف
رزق ہے اُس طرف اُدھر جاؤ

جاوید عارف نے اپنے اندازِ کلام میں روایتی لب و لہجے کا سہارا لیا ہے۔ یہ کوئی معیوب بات بھی نہیں ہے۔ ہمیں عہد بہ عہد خوبصورت شاعر روایت سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شاعری شاخ شاخ نغمہ سرائی ہے تو روایت اس پیڑ کی جڑ ہے، تنا ہے۔ پیڑ سے کٹ جانے والی شاخ اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی۔ تمام بڑے شاعروں نے روایت سے استفادہ کر کے نئی روایتوں کی

بنیاد رکھی ہے۔ جاوید عارف گو کسی نئی روایت کی بنیاد کا خوگر نہیں ہے پھر بھی روایت کو اختیار کر کے اپنے انداز و اظہار میں آسانیاں پیدا کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام میں جا بجا اساتذہ کے کلام سے استفادہ کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ اس نے اپنے ذاتی تجربات کو موضوع بنایا ہے اس لئے یہ بات اسے روایت میں زندگی فراہم کرتی ہے :

اب کوئی شب ، شب وصال نہیں
جب تیری دید کی مجال نہیں

○

اِک اسی خوش ادا کی بات کرو
ہاں! اُسی بے وفا کی بات کرو
آج پھر ڈوبنے کو دل چاہے
آج پھر ناخدا کی بات کرو

○

جب سیاہ رات ہو اور چاند نکلتا دیکھوں
تیرے آنے کی ادا یاد میں مُسکائے ہے

○

شب وصل پر بھی تھے ہجراں کے سائے
نہ وہ کُھل کے روئے نہ ہم مسکرائے

○

کتابِ وفا میں فسانے ہیں میرے
وہ یادوں کے سارے خزانے ہیں میرے
یہ شعر و سخن ، قہقہے ، یہ فسانے
تمھیں سوچنے کے بہانے ہیں میرے

جاوید عارف کی شاعری کا بنیادی موضوع عشق و محبت ہی ہے۔اس نے زندگی کی تمام تلخیوں کو شعروں کے قالب میں ڈھالا ہے مگر اس کی شاعری کا اجتماعی بہاؤ محبت اور محبوب کی سمت ہی رہا ہے۔کہا جا سکتا ہے کہ عارف محبت کا شاعر ہے۔اس کا محبوب مہربان بھی ہے اور نامہربان بھی ہے۔کبھی محبوب صنف مخالف کی صورت میں ہے تو کبھی وطن کے روپ میں۔ معاشرے کا دکھی فرد بھی اس کا محبوب ٹھہرتا ہے اور گھر بھی اس کی ایک محبت ہے۔یوں عارف نے اپنی شاعری میں محبت ہی کی تصویر کشی کی ہے۔وہ خود محبت کرتا ہے اور دوسروں سے بھی یہی تقاضا کرتا ہے۔یہی کی اس کی شعری سچائی ہے :

دوستو! دوستی کی بات کرو
کوئی تو دل لگی کی بات کرو
زہر گھولو نہ تم خوشامد کا
اتنی نہ عاجزی کی بات کرو
بیتی باتوں کا ہو چکا نوحہ
اب تو عارفؔ خوشی کی بات کرو

○

ہنستا چہرہ روتی آنکھیں باتیں ہیں دل والوں کی
عارفؔ تم پر کیا بیتی ہے کب سمجھیں فرزانے لوگ

''ویراں پڑے ہیں راستے'' جاوید عارف کی طرف سے اردو کے شعری ادب میں ایک اضافہ ہے۔ ہمارے ادبی ماحول کی روایت رہی ہے کہ ہر آنے والے کا خوش دلی اور خندہ پیشانی سے استقبال کیا جاتا ہے۔ جاوید عارف گو چھوٹی عمر سے شاعری کی لت میں پڑا ہوا ہے لیکن ادبی دنیا میں اس کا یہ پہلا قدم ہے۔ پہلے قدم پر ملنے والے حوصلے سارے سفر کو یادگار بنا دیتے ہیں۔ جاوید عارف نے اپنے احساسات کو شاعری میں ڈھالا ہے۔ شعر شعر اپنے وجدان کے پھول کھلائے ہیں۔ ان پھولوں میں محبت کی خوشبو ہے، ناتمام خواہشوں کے رنگ ہیں۔ اپنے دل کی دنیا کو اس نے الفاظ میں بسا دیا ہے۔ دلوں کے روگی اس کی سیاحت کریں گے تو بہت کچھ اپنے دل سے قریب پائیں گے۔ یوں زندگی کے ویران راستوں کو نئے اور پرعزم مسافر مل جائیں گے۔

زندگی بھولی ہوئی ہے ضابطے
دور تک ویراں پڑے ہیں راستے

فضل احمد خسرو

اوکاڑا

۱۸ رمارچ ۲۰۰۹ء

جاوید رؤف سے جاوید عارف تک

اپنے بارے میں کچھ کہنا کارِ دشوار ہے اور اپنے تئیں عجیب بھی کہ:

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

یوں بھی اس کتاب میں جو کچھ میں نے کہا ہے، اپنے متعلق ہی تو کہا ہے، کچھ ہڈ بیتی ہے، کچھ جگ بیتی ہے۔ لیکن زیادہ تر وہی کچھ ہے جو میرے جسم وجاں یا میرے اطراف میں ہوتا رہا ہے۔

میں ہوں۔ رانا جاوید رؤف خان، 3 / مارچ 1958ء کو سیالکوٹ کے گاؤں رئیہ خاص میں پیدا ہوا۔ یہ گاؤں نارووال کے پاس ہے اور وہاں ان دنوں میرے ننھیال کی چھوٹی موٹی زمینداری تھی۔ ننھیال والوں نے نام فاروق رکھا مگر والد صاحب کو جاوید پسند آیا۔ اس طرح میں جاوید رؤف ہو گیا۔ میرے والد صاحب عبدالرؤف صوفی اوکاڑا میونسپل کمیٹی میں ملازم تھے۔ یوں یہ سیالکوٹی اب تک اوکاڑوی ہے۔

پرائمری، ایم سی پرائمری سکول لیڈیز باغ اوکاڑا سے کی، مڈل اور میٹرک ایم۔ سی ہائی سکول اوکاڑا سے بالترتیب 1972ء اور 1974ء میں پاس کیے۔ 1976ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج اوکاڑا سے .F.Sc پری میڈیکل میں پاس کی۔ گورنمنٹ کالج اوکاڑا میں دو سالہ تعلیمی دور اس لئے اہم رہا ہے کہ وہاں میں پروفیسر ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کا شاگرد بھی رہا اور ان کے زیر سایہ چھپنے والے کالج کے رسالہ ''احساس'' کا سٹوڈنٹ ایڈیٹر بھی رہا۔

اُن دنوں بہت زیادہ Competition کی وجہ سے میڈیکل میں داخلہ نہ ہو سکا اور میرے والدِ محترم کی مجھے ڈاکٹر بنانے کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ میں نے اُن کی دوسری

ترجیح یعنی فوج میں افسر بننے کی کوشش کی اور تمام امتحانات اور میڈیکل ٹیسٹ پاس کر کے کوہاٹ I.S.B میں فائنل انٹرویو تک جا پہنچا۔ وہاں پر زور لہجے میں فوجی فیملی بیک گراؤنڈ سے متعلقہ سوالوں سے اندازہ ہو گیا کہ یہ بیل بھی منڈھے نہ چڑھے گی اور ایسا ہی ہوا۔

78-1977ء کا عرصہ گورنمنٹ کالج ساہیوال میں .B.Sc کرتے گزرا۔ جناح ہوسٹل میں رہا۔ 1978ء میں .B.Sc کے فائنل امتحانات دے رہا تھا کہ چند ناگفتنی وجوہات کی بنا پر آخری پیپرز نہ دے سکا۔ پھر بعد میں کبھی بھی .B.Sc مکمل نہ ہو سکی۔ ہاں بعد میں 1985ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے گریجویشن ضرور مکمل کر لی۔

1978ء سے 1981ء کا عرصہ اُسی طرح گزرا جیسے ایک بے روزگار کا ہوتا ہے۔ کبھی چند ماہ کے لئے شیزان فیکٹری لاہور میں شپنگ اسسٹنٹ کی نوکری کی تو کبھی چند ماہ باٹا پور میں باٹا فیکٹری میں ٹرینی فورمین کی۔ پھر والد صاحب سے جو معاملات 1978ء میں بگڑ گئے تھے وہ آہستہ آہستہ بہتر ہوئے تو لاہور سے واپس اوکاڑا آ گیا۔ یہاں پھر وہی شب و روز یعنی کبھی کچھ ماہ کے لئے تمباکو فیکٹری میں سیزن لگ جاتا یا پھر میونسپل کمیٹی میں کوئی فرد چھٹی پر جاتا تو چونگیات میں کچھ عرصہ کے لئے نوکری مل جاتی۔ مگر مستقل کوئی ذریعہ روزگار نہ تھا۔

بالآخر والد صاحب نے سخت گیری سے پھر میری سرکشی اور آوارگی پر گرفت کی اور 1981ء میں ایک بیروزگار کو شوہر بنا دیا گیا۔ میری بیوی بچپن ہی سے میری منگیتر تھی۔ اس فوری شادی میں میرے بھائی عزیزم انعام الرؤف خان کا بھی ہاتھ تھا کہ وہ مجھ سے تیسرے نمبر پر تھے اور انہیں فوری انگلینڈ جانا تھا جہاں ہماری چچا زاد سے ان کی شادی طے تھی۔ سو وہ 1981ء میں ہی میری شادی کے بعد عازمِ انگلینڈ ہو گئے۔ لیکن ایک خوابوں کی دنیا کا باسی روٹی روزی کی تلاش میں کڑی دھوپ میں سڑکوں پر آ گیا۔ 1982ء میں کچھ مہربانوں کی مہربانی اور زر پرستی واپڈا میں نوکری کا باعث بنی۔ اس ضمن میں چھوٹے

بھائی طیب رؤف خان کا ذکر ضروری ہے جو کہ 1976ء میں میٹرک کے بعد چونگیات میں نوکری کر رہے تھے اور میری تنگی تُرشی میں میرے معاون تھے۔ اس نوکری کے حصول میں بھی اُن کا مالی اور اخلاقی تعاون شامل تھا۔

واپڈا میں کلرکی سے کمرشل اسسٹنٹ تک لمبا دور ہے مگر شروع سے ہی رشوت لینے میں میری نا اہلی، میری لاپرواہی اور سرکشی مشکلات کا باعث رہی۔ خصوصاً مالی تنگی نے پریشان کیا تو ساتھ میں پارٹ ٹائم کے طور پر اسٹیٹ لائف بطور سیلز ایجنٹ جائن کر لی جس میں وقت کے ساتھ ساتھ سیلز مینجر کے عہدہ تک جا پہنچا۔ بعد میں میرا یہی جارحانہ انداز کام آیا اور میں واپڈا کی یونین کا وائس چیئر مین اور بعد میں کئی سال چیئر مین رہا۔ اسی طرح اسٹیٹ لائف میں بھی بھر پور یونین بازی کی۔

یہ تمام ہنگامے تو وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھے۔ میں شادی کے پہلے تین سالوں میں دو بیٹوں کا باپ بن چکا تھا۔ لیکن جب بھی تنہائی ملتی تو پریشان ہو جاتا۔ ان ہنگاموں نے طبیعت کی بے چینی اور حالات کی وحشت کم نہ کی تھی۔ میں سوچتا کہ صاحب یہ کیا؟ کیا ایسے ہی صبح کو شام کرنا ہے؟ میں ایسا تخیل پسند شخص ہوں جس سے نوجوانی میں جس نے بھی پوچھا کہ مستقبل میں کیا کرنے کا ارادہ ہے تو ایک ہی جواب ہوتا کہ ''دنیا گھومنے کا''۔ ابھی ایسی عمر نہ تھی کہ کوئی لوبھ یا لالچ ہوتا۔ شاید اسی لئے رب کائنات نے یہ خواہش منظور کر لی۔ ایک محنتی، ایماندار، سخت گیر مگر اوسط درجہ کی مالی حیثیت رکھنے والے سرکاری ملازم عبدالرؤف صوفی کا درجن بھر بہن بھائیوں میں سب سے بڑا بیٹا، نامساعد حالات اور وسائل کی کم یابی کے باوجود ہواؤں کے گھوڑے پر سوار پچھلی دو دہائیوں سے زائد عرصہ سے دنیا میں درجنوں ممالک کی سیر کر چکا ہے اور ہنوز سفر جاری ہے۔

اسباب یوں پیدا ہوئے کہ میرے چھوٹے بھائی حاجی انعام الرؤف خان جو

1981ء سے ازدواجی ویزہ پر انگلینڈ میں تھے 1986ء میں تشریف لائے۔ انہوں نے مجھے کافی حوصلہ دیا اور واپس جا کر میرے لئے سپانسر لیٹر بھیج دیا۔ ساتھ میں ہر طرح کی مدد اور راہنمائی بھی فراہم کی۔ اور یوں 1987ء میں پہلی دفعہ پنچھی نے پنجرے سے اڑان بھری اور انگلینڈ جا پہنچا۔ اسی دورانیہ میں انعام صاحب کے ساتھ بیلجیئم، ہالینڈ اور فرانس کی بھی سیاحت کی اور تین ماہ کے اس سیاحتی پروگرام کے بعد واپس لوٹ آیا۔

یہ میری انٹرنیشنل خاک نوردی کی ابتداء تھی۔ بعد میں تقریباً ہر سال میں 6 ماہ کے لئے کسی نہ کسی ملک میں نکل جاتا۔ اس دوران سعودی عرب میں عمرہ کی سعادت حاصل کی۔ درجنوں یورپی اور مڈل ایسٹ ممالک کی سیر کی۔ صرف انگلینڈ اور امریکہ ہی درجنوں بار گیا۔ سعودی عرب اور ایران میں مذہبی زیارتیں اور مصر میں تاریخی مقامات کی سیر بھی کی۔ ان تمام سفروں میں کون سنگ رہا؟ کس نے رفاقتیں نبھائیں؟ اور کون راہ میں چھوڑ گیا یہ ایک الگ کہانی ہے۔

اس کہانی کا ایک نہایت اہم پہلو یہ ہے کہ 1994ء تک میں 3 بیٹوں اور ایک بیٹی کا باپ بن چکا تھا۔ مجھے اس طویل آوارہ گردی میں اولاد کی طرف سے کبھی پریشانی نہیں ہوئی۔ میری بیگم نے مجھے کبھی پریشان نہیں کیا۔ کبھی میرے ساتھ جانے کی ضد نہیں کی۔ اولاد کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ دی اور میرے والدین اور بہن بھائیوں کو بھی کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اس ضمن میں وہ میری نہایت شکر گزاری کی مستحق ہے (اب بیگم اور بچے یورپ کی سیر کر چکے ہیں)۔

ہاں! شاعری کیسے شروع کی؟ ایک تخیل پرست آدمی شاعر یا مصور کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے؟ 74-1973ء میں جب میٹرک میں تھا اور لفظوں کا کچھ شعور آیا تو مصرعے موزوں ہونے لگے۔ ''احساس'' کی ایڈیٹری اور پروفیسر ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کی شاگردی نے اعتماد بخشا۔ گورنمنٹ کالج ساہیوال میں B.Sc کے لئے دو سال رہا۔ وہاں مختلف مقابلوں

میں ''طرح مصرع'' پر طبع آزمائی کی اور پھر عدیم الفرصتی کے باوجود یہ سفر جاری رہا۔ کبھی سالوں میں ایک غزل اور کبھی دنوں میں کئی غزلیں۔

محمد اکرم اشفاق اور جاوید مہدی جیسے مہربان دھنیں بنا کر ان غزلوں کو محفلوں میں گاتے رہے اور حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ میرے خالہ زاد برادرم ڈاکٹر میاں ظفر مقبول کئی سالوں سے اصرار فرمارہے تھے کہ اسے شائع کرواؤ۔ اُن کی ہر طرح کی امداد اور تعاون کی پیشکش میرے ساتھ تھی اور اس کتاب کی اشاعت میں اب بھی وہ انتہائی معاون ہیں۔ جس کے لئے وہ میرے شکریہ کے مستحق ہیں۔

بالآخر میں نے کم مائیگی کے احساس کے ساتھ اپنی کاوشیں محترم ڈاکٹر فضل احمد خسرو کے سامنے رکھیں اور اصلاح کی گذارش کی اور یہ اُن کی راہنمائی، حوصلہ افزائی اور تعاون ہی سے ممکن ہوا کہ یہ کتاب اب آپکے ہاتھوں میں ہے۔ کتاب کی تزئین وتدوین اور نام سمیت تمام مراحل میں وہ میرے سنگ رہے ہیں جس کے لئے شکر گزاری کے علاوہ کیا کہوں؟ محمد تبسم شاد اور شاہد لطیف (ایسکام کمپیوٹرز) کا بھی ممنون ہوں کہ اس کتاب کی آرائش و زیبائش میں میرے ساتھ بساط بھر کوشاں رہے۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کی کوئی بھی چیز آج تک کسی اخبار یا رسالہ میں شائع نہیں ہوئی ہے۔

آیئے! مجھے میرے اشعار میں دیکھئے۔ میں کیسا ہوں، جیسا بھی ہوں، بس ایسا ہی ہوں............

جاوید عارف
مکان نمبر 146 گلی نمبر 2
محلہ غازی آباد اوکاڑا
فون: 0321-3090121

۲۰ رمارچ ۲۰۰۹ء

○

زندگی بھولی ہوئی ہے ضابطے
دور تک ویراں پڑے ہیں راستے

حمد

مجھ کو ذوقِ آگہی دے ، اے خدا
تیرگی میں روشنی دے ، اے خدا

ہو عطا اب راستی کا راستہ
خوشگوار اک زندگی دے ، اے خدا

رزق کے سوتے ہیں تیرے ہاتھ میں
پاک روزی کی خوشی دے ، اے خدا

اک مزاج خسروی دے یا غنی
ایک اپنی دوستی دے ، اے خدا

گو بُرا ہوں پر ہوں میں بندہ ترا
مجھ کو خوئے بندگی دے ، اے خدا

جو ترے اظہار کا باعث ہوا
مجھ کو اس کی عاشقی دے ، اے خدا

یا ملک ، عارفؔ کی یہ فریاد ہے
اس کو خوئے عاجزی دے ، اے خدا

نعت

ہم سے خوش بخت ہی اس در پہ فدا ہوتے ہیں
کتنے خود دار ہیں جو انؐ کے گدا ہوتے ہیں

جس پہ ہو لُطف و کرم وہی نمایاں ہوگا
اُنؐ کے کوچے کے تو ذرے بھی ضیاء ہوتے ہیں

اُنؐ کا ہو جود و کرم تب ہی اماں ملتی ہے
اپنی کوشش سے کہاں فرض ادا ہوتے ہیں

آؤ فریاد کریں شائد کہ پناہ مل جائے
انؐ کے الفاظ تو منظورِ خدا ہوتے ہیں

سوچتا رہتا ہوں کیسے میں انہیں بھا جاؤں
ورنہ تو لاکھ یہاں آبلہ پا ہوتے ہیں

جو بھی محبوبؐ کہے سر کو جھکا دو عارفؔ
''وادیٔ عشق کے دستور جدا ہوتے ہیں''

○

میں گھرے اندھیروں میں سچ بولتا ہوں
میں دھندلے سویروں میں سچ بولتا ہوں

غمِ دل ، غمِ جاں ، غمِ جانِ جاناں
میں اِن غم کے ڈھیروں میں سچ بولتا ہوں

یہاں پارسا ہیں یہاں سب خدا ہیں
میں ان سب کے گھیروں میں سچ بولتا ہوں

ہوں منصور ، مجھ کو بھی سولی چڑھا دو
میں شعروں اُکیروں میں سچ بولتا ہوں

اٹھاؤں بھلے سے میں نقصان عارفؔ
مگر سب وڈیروں میں سچ بولتا ہوں

O

خامشی اوڑھ کے شکوہ نہ شکایت کرنا
ایسی اُلفت کی کبھی مجھ سے نہ چاہت کرنا

چھوڑ کر جانا کہ ہم آئیں منانے تم کو
اس طرح کی نہ میری جان حماقت کرنا

ہم نئے دور کے دلبر ہیں ذرا دل میں رہے
ہم کو دیوانہ سمجھ کر نہیں نفرت کرنا

ہم تو اُلفت میں ہیں اخلاص کے قائل، یارو!
گر جو دو طرفہ نہ ہو کیسی محبت کرنا

خود کو عارفؔ جی سمیٹو کہ یہ دل پاگل ہے
بھول مت جانا کڑی دھوپ میں محنت کرنا

○

کچھ اس ادا سے ہم سرِ مقتل کھڑے رہے
ششدر ہماری جان کے قاتل کھڑے رہے

حیرانگی تھی ایک ہی ، خنجر بکف ہے کون
ایسا نہیں کہ ہم یونہی غافل کھڑے رہے

وہ دیوتا تھا ہم پہ توجہ نہ دے سکا
ہم انکسار اوڑھ کے سائل کھڑے رہے

اک گھونٹ مانگنا بھی گوارہ نہ تھا ہمیں
ہم جاں کنی میں پیاسے لبِ ساحل کھڑے رہے

مانا کہ رائیگاں تھیں ہماری یہ کاوشیں
ہم غم کی آندھیوں کے مقابل کھڑے رہے

○

جنہیں جنوں تھا نئی بستیاں بسانے کا
وہ رستہ بھول گئے گھر کو لوٹ آنے کا

خدا کو چھوڑ کے اب ناخدا کو سجدہ کریں
نجانے کیسا چلن ہو گیا زمانے کا

انہیں بھی مشقِ ستم کے لئے ضرورت تھی
ہمیں بھی شوق تھا کچھ زحمتیں اُٹھانے کا

جو اُن سے پوچھا کہ ہم بے رخی کو کیا سمجھیں
تو ہنس کے بولے کہ موسم ہے زخم کھانے کا

تمہیں کہا تھا کہ نازک ہیں پاؤں مت آنا
بہت خراب ہے رستہ غریب خانے کا

کہا یہ کس نے کہ ہم ڈھونڈتے تھے تجھ میں وفا
فقط تھا شوق تیرے حوصلے بڑھانے کا

ہمیں تو ترکِ تعلق کا حوصلہ ہی نہ تھا
تمہیں ہی زُعم تھا بس دور ہم سے جانے کا

لو جا کے وقت کی گردش میں انتظار کرو
بڑا غرور تھا تم کو ہمیں بھلانے کا

کسی نے پوچھا کہ کیسا ہے آج کل عارفؔ
تو بولے چھوڑو جی جھوٹا ہے اک زمانے کا

○

جو عشقِ مجازی میں وفا ڈھونڈ رہا ہے
دیوانہ ہے پتھر میں خدا ڈھونڈ رہا ہے

کب کیسے کہاں کیونکر ہار گیا بازی
یہ نکتہ میرا ذہنِ رسا ڈھونڈ رہا ہے

اک حشر بپا ہے کہ سبھی رنج میں ڈوبے
اب صاحبِ دولت بھی دُعا ڈھونڈ رہا ہے

اس دورِ خرابی میں کہاں خضر کو ڈھونڈوں
اب خضر بھی لوگوں کا پتہ ڈھونڈ رہا ہے

کل تجھ کو بڑے زُعم سے جو چھوڑ گیا تھا
عارفؔ وہ تجھے یار تیرا ڈھونڈ رہا ہے

○

وادیِ عشق میں کچھ لوگ فنا ہوتے ہیں
باقی سب یار تو بس آبلہ پا ہوتے ہیں

ایک حسرت ہی رہی دیکھ لوں جی بھر کے انہیں
اُن کی عادت ہے کہ وہ مثلِ صبا ہوتے ہیں

یہ بھی مانا کہ مقدر نے پریشان کیا
اور کچھ روگ تو ماضی کی سزا ہوتے ہیں

خونِ دل دینے کا جذبہ ہے تو شائد کر لو
فقط باتوں سے کہاں فرض ادا ہوتے ہیں

کب یہ عارفؔ نے کہا وصل عطا ہو ہم کو
جانے کیا بات ہے وہ جس پہ خفا ہوتے ہیں

○

رنج و الم میں ڈوبے چناروں کی بات کر
اک تو ہی تو نہیں ہے ہزاروں کی بات کر

اہلِ زمیں سے اپنا نباہ ہی نہیں تو پھر
اے دوست اب تُو چاند ستاروں کی بات کر

مدت ہوئی کہ ہم ہیں خزاؤں کے میزبان
اے خوش ادا تو ہم سے بہاروں کی بات کر

اب کے برس بھی دیس میں گل ہی نہیں کھلے
چل اجنبی سے دیس ، دیاروں کی بات کر

جب اتنی کاوشوں سے بھی ڈوبے نہیں کبھی
اے گردشِ مدام ، کناروں کی بات کر

ہو اس میں اعترافِ محبت ، نہیں گماں
اے نامہ بر! تو خفیہ اشاروں کی بات کر

○

اپنی ہستی کو مِٹا کر دیکھئے
دوسروں پر گھر لُٹا کر دیکھئے

اُس کو پانا تو بہت دشوار ہے
پہلے اپنے کو تو پا کر دیکھئے

دوسروں کے درد کو پہچانیے
اپنے دامن کو جلا کر دیکھئے

پھول بن جائیگی گہری خامشی
بس ذرا سا مسکرا کر دیکھئے

اس ہُنر میں تاک ہو عارفؔ جی تم
اُن کو دل سے تو بھلا کر دیکھئے

○

سچ کا ملنا مشکل ہے
تو بھی کتنا پاگل ہے

کیسی تیری دُنیا ہے
ہر اک سانس ہی گھائل ہے

یا رونق سے ، بستے ہیں
شہرِ خرابی منزل ہے

آج تو میرے پاس رہو
آج مرا دل بے کل ہے

ہر سو جوشِ بہاراں ہے
سہمی سہمی بلبل ہے

بجتا ہوں ، پر دھنتا ہوں
یہ دنیا اک دلدل ہے

چاروں اور اندھیرے ہیں
دکھیاروں کی منزل ہے

○
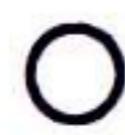
زندگی بھولی ہوئی ہے ضابطے
دور تک ویراں پڑے ہیں راستے

جب زمانے نے ہنسایا ہنس دیے
جب ستمگر نے رُلایا ، رو دیے

کون ہے جو گردشوں میں ساتھ دے
چل پڑے خود ہی جدھر دل لے چلے

ٹوٹتا ہے جب حصار بے خودی
بڑھتے جاتے ہیں دلوں میں فاصلے

میں نے اپنا آزمایا حوصلہ
غیر کے سب وار سینے پر سہے

ڈھونڈتا ہے کیا او غافل تو یہاں
قافلے والے تو کب کے جا چکے

خود نکل جائیں گے ہم منجدھار سے
ناخدا چاہے بھنور میں چھوڑ دے

ہم محبت کا دھرم اپنائیں گے
یہ جہاں چاہے ہمیں کافر کہے

حق و باطل کی یہ ایسی جنگ ہے
جیتتا ہے وہ جو حق کو ساتھ لے

چھوڑ دو عارفؔ پرانی داستاں
لوگ یاں بیٹھے ہیں کافی دل جلے

○

اب کوئی شب ، شبِ وصال نہیں
جب تیری دید کی مجال نہیں

اک زمانہ تھا تو ہمارا تھا
کیا کریں اب وہ ماہ و سال نہیں

نام آیا ہے اُن کے نام کے ساتھ
اپنے تو ہوش ہی بحال نہیں

بازئ دل کو دل سے تو کھیلو
ہار یا جیت کا سوال نہیں

جی تو لیں گے نہ چاہے خوش گزرے
زندہ رہنا کوئی کمال نہیں

جو بھی چاہتا ہوں کہہ نہیں پاتا
یہ غزل بھی تو حسبِ حال نہیں

آؤ عارفؔ ذرا تلاش کریں
حسن کا اسقدر بھی کال نہیں

○

ہوا کے رُخ کے مخالف دیا جلانا ہے
وگرنہ بات وہی ہے ، وہی فسانہ ہے

ذرا سا خود کو سنبھالو کہ وقت مشکل ہے
محبتوں کا مخالف بڑا زمانہ ہے

ذرا سا ہنس کے بلا لو کہ دل رہے شاداں
وگرنہ شہر ہمیں چھوڑ کر تو جانا ہے

بڑا کٹھن ہے غمِ ہجر کا سفر پھر بھی
یہ بوجھ اے دلِ بے کس تمہیں اُٹھانا ہے

تمہیں خبر ہے کہ میں بے نوا نہیں عارفؔ
یہ سوچتا ہوں مقابل تمہارے آنا ہے

○

مِلا ہے مخملوں کا کب بچھونا
ہمارا کام ہے سڑکوں پہ سونا

سکھایا ہے تمہی نے مہربانو!
ہمیں آتا کہاں تھا رونا دھونا

مجھے دل کے زیاں کا دکھ نہیں ہے
مجھے رُلوا رہا ہے تیرا رونا

کبھی عہد جوانی میں نہ سوچا
وہی کاٹیں گے جو کچھ کہ ہے بونا

یہ تاریخِ محبت کہہ رہی ہے
محبت کیا ہے؟ بس برباد ہونا

○

اشکوں کی یہ گھٹائیں طوفان بن نہ جائیں
پھر وحشتوں کا میری سامان بن نہ جائیں

تم یاد نہ دلاؤ بھولی ہوئی وہ باتیں
سن سن کے چارہ گر بھی انجان بن نہ جائیں

میری داستانِ غم میں کچھ اتنی بے بسی ہے
میری راحتوں کے ساتھی غمِ جان بن نہ جائیں

ڈر ہے مجھے کہ غم سی خانہ خراب چیزیں
تیرے دل کی مستقل ہی مہمان بن نہ جائیں

انسان آج کل کے جس طور چل پڑے ہیں
ڈر ہے مجھے کہ اک دن حیوان بن نہ جائیں

جا کر انہیں بتا دو اس میں بھلا ہے ان کا
یہ حسن کے جھمیلے بھگوان بن نہ جائیں

لکھنے لگے ہو تم جو داستانِ حسرت
عارفؔ جی دیکھنا کہ دیوان بن نہ جائیں

○

کیسا اُس نے یہ وار کر ڈالا
روح کو بے قرار کر ڈالا

دل ہی کچھ ایسا بے وفا نکلا
اپنے دشمن سے پیار کر ڈالا

دشمنی دوستی سے بہتر ہے
دوستوں نے تو خوار کر ڈالا

زندگی دور ہی رہی ہم سے
موت سے ہم کنار کر ڈالا

راحتیں مل گئیں تھیں گو ہم کو
ہجر نے اشکبار کر ڈالا

پہلے ہی اس قدر وہ قاتل تھے
تو نے بھی آبدار کر ڈالا

میرے عارفؔ یہ کیا کیا تو نے
دل کا سودا ادھار کر ڈالا

○

اس زمانے میں کہاں انسان ہے
جو بھی ملتا ہے وُہی بھگوان ہے

کشمکش ، بے چارگی اور بے بسی
زندگی کا بس یہی عُنوان ہے

سانس کی اک ڈور ہے اَٹکی ہوئی
اس تنِ مُردہ میں اتنی جان ہے

اک جھلک تیری ہمیں مقصود ہے
زندگی میں اب یہی ارمان ہے

صابر و مجبور و خستہ حال ہے
تیرے عارفؔ کی یہی پہچان ہے

○

کہتے ہیں آئیڈیل نہیں ملتا
میں اُسے ڈھونڈ کر ہی چھوڑوں گا

گو قیامت کا ہے سفر در پیش
میں کہیں تھک کے رُک نہیں سکتا

فرش پر ، عرش پر ، کسی بھی جگہ
میں اُسے ہر نگر میں ڈھونڈوں گا

ہر طرف ہیں مصیبتیں پھر بھی
دل کا یوں ہارنا نہیں اچھا

ایک عارفؔ میاں غنیمت ہیں
ڈھونڈے سے آدمی نہیں ملتا

○

گردش میں جام لاؤ ، طبیعت اداس ہے
کچھ تشنگی مٹاؤ ، طبیعت اداس ہے

اس آگہی نے ساقیا! ہم سے قرار چھینا
کچھ بے خودی ملاؤ ، طبیعت اداس ہے

مجھ کو پلاؤ اتنی کہ میں اُس کو بھول جاؤں
یا اُس کو ڈھونڈھ لاؤ ، طبیعت اداس ہے

وہ جھیل جیسی آنکھیں ، وہ گھٹاؤں جیسی زلفیں
وہ سادگی دکھاؤ ، طبیعت اداس ہے

کچھ ایسے پارسا تو پہلے بھی نہ تھے عارفؔ
نیکی ، بدی ، ہٹاؤ ، طبیعت اُداس ہے

○

ہم جو دشمن کو بھی جینے کی دُعا دیتے ہیں
ہم سے لوگوں کو بھی کچھ لوگ دَغا دیتے ہیں

وہ مسیحا ہیں تو پھر ہم سے گریزاں کیوں ہیں
دوسروں کو تو وہ دل کی بھی دوا دیتے ہیں

اُن کو اخلاص سے کہہ دیتے ہیں باتیں دل کی
اور وہ ہم کو ہی محفل سے اُٹھا دیتے ہیں

ہر طرف شہر میں بکھرے ہوئے نقلی چہرے
ہم سے معصوموں کو جینے کی سزا دیتے ہیں

جس طرف دیکھو، ریا کاری ہے اک دھوکہ ہے
سادہ لوگوں کو تو یہ لوگ مٹا دیتے ہیں

میرے قاتل کی یہ خوبی ہے کہ وہ ہنس ہنس کر
خون کے رنگ کو بھی نامِ حنا دیتے ہیں

ذکرِ عارفؔ پہ وہ چہرہ ہی چُھپا لیتے ہیں
لوگ اِس بات کو بھی نامِ حیا دیتے ہیں

O

اک اُسی خوش ادا کی بات کرو
ہاں اُسی بے وفا کی بات کرو

آج کچھ مہربان ہے ظالم
آج تو مدعا کی بات کرو

جانے کب کس جگہ پہ تھک جائے
کاروانِ فنا کی بات کرو

آج پھر ڈوبنے کو دل چاہے
آج پھر ناخدا کی بات کرو

دل بہت ہی اداس ہے عارفؔ
بس اُسی دِلرُبا کی بات کرو

○

جب تلک سانس کی کٹار چلے
تب تلک زندگی سے پیار چلے

جگ ہنسائی ہے پارسائی میں
اب گناہوں کا کاروبار چلے

میکدے کی طرف چلو یارو
ہوش مندی سے ہم تو ہار چلے

ہنستے رہنا بھی اک مصیبت ہے
آنسوؤں کی بھی اک پھوار چلے

اُس کے اُٹھتے قدم ہیں یوں جیسے
گلشنِ زیست کی بہار چلے

وہ نہیں آ رہا تو پھر کیا ہے
سانس کے ساتھ انتظار چلے

کس جگہ دل سکون پاتا ہے
ہم تو گلشن سے بے قرار چلے

اے وفاؤں کے دیوتا! ٹھہرو!
آپ کیوں یاں سے اشکبار چلے

مڑ کے دیکھا کئے وہ یوں عارفؔ
دل پہ آرے ہوں بے شمار چلے

○

مجھ کو خورشید کی بھی آس نہیں
کوئی مجھ جیسا محوِ یاس نہیں

کن اجالوں کی بات کرتے ہو
وہ اُجالے جو میرے پاس نہیں

وہ مسافر ہے زندگانی کا
اس لئے ہی تو وہ اُداس نہیں

میں تو اک چلتا پھرتا لاشہ ہوں
موت سے بھی مجھے ہراس نہیں

کس طرح اُس کے ساتھ چلوں
میری قسمت ہی مجھ کو راس نہیں

غم کا رطلِ گراں ہے نوش کیا
پھر بھی دیکھو میں بدحواس نہیں

چھوڑو عارفؔ بُھلا ہی دو ان کو
اب زمانہ قدر شناس نہیں

O

زندگی جو شکار کرتے ہیں
عشق کو اختیار کرتے ہیں

اُن پہ جو نفرتوں کے پیکر ہیں
ہم محبت نثار کرتے ہیں

کچھ عداوت ہو تو سنبھل جائیں
یار چھپ چھپ کے وار کرتے ہیں

زندگی سسکتی ملے ہر دم
لوگ مُردوں سے پیار کرتے ہیں

ہم ملیں یار یا بچھڑ جائیں
لوگ باتیں ہزار کرتے ہیں

گر محبت گناہ ٹھہرا ہے
ہم بصد افتخار کرتے ہیں

دن جو بیتے تمہاری یادوں میں
ہم انہیں بھی شمار کرتے ہیں

کیا یہ عزت ہے یا ہے رسوائی؟
ہم سے ساقی ادھار کرتے ہیں

ہم کو عارفؔ بتاؤ کیا گزری
ہم تیرا اعتبار کرتے ہیں

O

جب کوئی زخم کھا کے روتا ہے
خواہشوں کا قصور ہوتا ہے

وہ جو شب بھر تڑپتا رہتا ہے
اپنے اشکوں سے رات دھوتا ہے

کوئی منزل کی آس میں بھٹکے
کوئی منزل میں خواب بوتا ہے

وقت کا ساتھ دینا ہے جاگو
سونے والو! نصیب سوتا ہے

تجھ کو عارفؔ ہے ڈوبنا ، ڈوبو
دوسروں کو تو کیوں ڈبوتا ہے

○

اُس نے جلوؤں کو عام کر ڈالا
کام اپنا تمام کر ڈالا

اجنبی تھا یا کوئی جادوگر
مجھ سے پتھر کو رام کر ڈالا

اک نظر دیکھنا قیامت تھا
اک نظر ہی نے کام کر ڈالا

آرزوئے وفا تھی کی جس سے
اُس نے جینا حرام کر ڈالا

وہ جو کہتا ہے ہم وہ کرتے ہیں
صبح کو ہم نے شام کر ڈالا

اس کی یادوں میں اور کیا کرتے
شام کو نذرِ جام کر ڈالا

یا خدا بخش دینا عارفؔ کو
رازِ عشق اُس نے عام۔ کر ڈالا

○

گوری باہنوں کا ہار مت ڈھونڈو
حسن والوں کا پیار مت ڈھونڈو

بے وفائی کا بے خطا خنجر
جان لے لے گا یار مت ڈھونڈو

جس جگہ ماتا بھی بکتی ہو
چاہتوں کا بیوپار مت ڈھونڈو

جیب بھاری ہے تو ہزاروں ہیں
دوستی کو اُدھار مت ڈھونڈو

جبر کے زہر کی فضاؤں میں
پیار کا اقتدار مت ڈھونڈو

آرزوؤں پہ یاں ہے پابندی
موت کا اختیار مت ڈھونڈو

روحِ عارفؔ سے کہہ دو سو جائے
کون ہے زار زار مت ڈھونڈو

○

دل کو توڑو جشن مناؤ
ناچو ، گاؤ ، کھیل رچاؤ

کوئی رشتہ رکھو مجھ سے
میرے دشمن ہی بن جاؤ

خوف نہیں ہے سودو زیاں کا
عشق نہیں ہے بھاؤ تاؤ

دل ٹوٹا ہے ، ساز اچھا ہے
اچھا سا کوئی گیت سناؤ

سناٹے ہیں ، تنہائی ہے
مُطرب کوئی ساز بجاؤ

تنہائی کے ان ناگوں سے
للہ میری جان بچاؤ

کر دو بپا ، یاں جشنِ مسرت
خاموشی کو ، مار بھگاؤ

تعبیروں کو چھوڑو پیارے
خوابوں ہی سے دل بہلاؤ

کب تک دیکھوں راہ تمہاری
جانے والو! لوٹ بھی آؤ

خواہشِ منزل ہار ہے پیارے
عارفؔ بس تم بڑھتے جاؤ

○

میری ہستی صفحۂ ہستی سے مٹا دی جائے
''میں ہوں خود دار میری عمر گھٹا دی جائے''

مجھ کو کانٹوں پہ ذرا اور گھسیٹا جائے
میرے جرموں کی بھی فہرست بڑھا دی جائے

ان اسیران روایات سے کہہ دو جا کر
میری مٹی بھی ہواؤں میں اُڑا دی جائے

یا میرے جسم کو سکھ سیج مہیا کر دو
یا میری روح بھی سولی پہ چڑھا دی جائے

میرے دشمن تو میرا کچھ بھی نہیں کر سکتے
میرے اپنوں کو ذرا اور ہوا دی جائے

میرا احساسِ مروت ہی میرا دشمن ہے
میرے رستے سے یہ دیوار ہٹا دی جائے

وہ خیالات وہ افکار ہیں میرے دشمن
میرے ماضی سے میری جان چھڑا دی جائے

میں ہوں ناواقفِ دردِ محبت عارفؔ
میرے دل میں بھی ذرا آگ لگا دی جائے

○

اس جہانِ رنگ و بو میں جو نہ مل سکے ٹھکانا
تیرا منتظر ملوں گا، میرے پاس لوٹ آنا

زندگی نہیں ہے یہ زندگی میری جان
اتنا حسین موسم اور تیرا روٹھ جانا

تیرے عشق میں میری جاں میں خود کو بھول بیٹھا
ورنہ تھی اپنی عادت ہر اک کا دل دکھانا

لگتا ہے جیسے ہر سو کلیاں بکھر گئی ہیں
مجھ پر کرم تو کرنا ، ذرا پھر سے مسکرانا

تیری دل لگی نے مارا مجھے بے کلی نے مارا
مہنگا پڑا مجھے تو کافر سے دل لگانا

پیار کا نشہ ہے میں ہوش میں نہیں ہوں
ناصح یہ اپنے کلیے کسی اور کو سمجھانا

پھر کیا جو بڑھ گئے ہیں یہ ظلم کے اندھیرے
دوڑو کہ اب ہے عارف دل کا دیا جلانا

○

بپھرے طوفان میں غم خوار کناروں جیسے
جانے کیا ہوگئے جذبے وہ شراروں جیسے

اب تو ڈھونڈے سے بھی ملتا نہیں روشن چہرہ
جانے کب ڈوب گئے لوگ ستاروں جیسے

ایسے لگتا ہے کہ انگارے چبا بیٹھے ہیں
زہر میں ڈوبے ہوئے لفظ کٹاروں جیسے

ایسی تنہائی کہ اپنے سے بھی ڈر لگتا ہے
ہر طرف دور تلک گھر ہیں مزاروں جیسے

اُس کو دیکھا تو یہ دل مجھ سے سنبھالا نہ گیا
وحشتیں ٹوٹ پڑیں مجھ پہ ہزاروں جیسے

آج شیشے میں انہیں دیکھ کے میں ڈر ہی گیا
ہائے وہ لوگ جو عارفؔ تھے بہاروں جیسے

○

کہیں چھپ کر نہیں یارو سرِ بازار بیٹھے ہیں
علاجِ قوم کے داعی ہی خود بیمار بیٹھے ہیں

نہیں ہے صرف بنگلہ کار ہی پیمانہ عزت کا
کہ کچھ ٹوٹے گھروندوں میں بھی عزت دار بیٹھے ہیں

اگر ہے دعویٔ چارہ گری اے خادمانِ قوم
تو سڑکوں پر بھی یزداں ہی کے کچھ شاہکار بیٹھے ہیں

وہ جس کو مفلسی اور بے کسی نے قتل کر ڈالا
اُسی کم بخت شاعر کے یہ سب غم خوار بیٹھے ہیں

بھری محفل ہے کب پھر الوداع کو آئیں گے ساتھی
چلو عارفؔ جی چل بھی دو کہ سب دلدار بیٹھے ہیں

O

وقف جس واسطے میں نے تھی عقیدت کر دی
اس ستمگر نے تو 'رونا' میری قسمت کر دی

جو بھی الفت سے ملے مجھ کو ریاکار لگے
ایک ظالم کی عنایت نے یہ حالت کر دی

وہ ملے گا بھی تو بولوں گا ، نہ دیکھوں گا اُسے
میں نے سوچا تھا ، نگاہوں نے شرارت کر دی

اُس کے کوچے میں کسی طور قدم نہ رکھتے
دل ہی کم بخت نے ہم سے تو بغاوت کر دی

اُس کی ٹھوکر نے مجھے جینے کا اک ذوق دیا
اُس نے گر گر کے سنبھلنا میری عادت کر دی

○

آؤ کچھ کام ہی کرو یارو
زندگی کے لیے لڑو یارو

خواہشوں کے حسین چنگل سے
نکلو نکلو ، چلو چلو یارو

مت ڈرو سختی منازل سے
حوصلہ کرکے تم بڑھو یارو

راستے بھی فریب دیتے ہیں
اپنے رستے پہ تم رہو یارو

آسماں ڈھونڈھتا پھرے برسوں
ایسی ہی موت تم مرو یارو

○
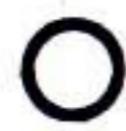
آنکھ سے آنسو بہے اور دل کی پونجی تو گئی
جب سے ہم کو اے صنم تم سے محبت ہو گئی

اس قدر رسوا کیا مجھ کو تمہاری چاہ نے
ایک عزت تھی سو وہ بھی تیرے در پر کھو گئی

عمر بھر کی کاوشوں سے بھی نہ جن کو چُن سکوں
تیری یاری میرے رستے میں وہ کانٹے بو گئی

زندگی اپنی تو ساری نیند ہی میں کٹ گئی
ہم اگر جاگے کبھی قسمت ہماری سو گئی

وہ بھلا پھر پیار کی خواہش کرے گا کس طرح
نفرتوں کے درمیاں جس بھی دیے کی لَو گئی

اس قدر دھوکے دیے مجھ کو میرے دم ساز نے
دوستی کے نام سے عارفؔ کو نفرت ہو گئی

○

طوفانِ درد و غم سے ، ہوتی رہی تباہی
ڈوبا کیے سفینے ، بڑھتے رہے سپاہی

میں جونہی واں پہ پہنچا میرے ساتھ چل دیا وہ
میرے انتظار میں تھا ، دِلا! تیزگام راہی

تو نے مجھے بھی نفرت سے دور کر دیا ہے
میں نے تو اے ستم گر، الفت تھی تیری چاہی

اِس ہجر میں میری جاں کچھ اس طرح سے گزری
تڑپا ہوں اس طرح سے جل بن ہو جیسے ماہی

بہتر ہے سب بُرائی اپنے ہی سر پہ لے لو
عارفؔ جی کر سکو گے ثابت نہ بے گناہی

○

تیری یادیں ہیں ، یہ کالی رات ہے ، تنہائی ہے
ہجر میں اب کے سمے ہر رات یوں بھی آئی ہے

مجھ کو تو نے بخش دی ہے، بے بسی بے چارگی
تیرے در سے دوسروں نے زندگی بھی پائی ہے

وہ تو کہیے احترامِ یار ہے پیشِ نظر
ورنہ رستے میں کوئی کوہسار ہے نہ کھائی ہے

کیسے ممکن ہے کہ تجھ کو میں بھلا دوں جانِ جاں
گو کہ تیری بے رُخی کے روبرو پسپائی ہے

یہ کرشمہ ہے تمہاری دلبری کا اے صنم
غیر نے بھی کہہ دیا عارفؔ بڑا سودائی ہے

○

دل جو قابو میں نہ ہو ایسی خطا کون کرے
تجھ کو پانے کی دعا تُو ہی بتا کون کرے

ہر نیا تیر تیرے نام سے برسا مجھ پر
تیری الفت کا یہاں دعویٰ بھلا کون کرے

گلشنِ زیست کے سب گل ہیں تیرے نام کئے
اور کچھ اس سے سوا جانِ وفا کون کرے

ہر نیا لمحہ نئے غم کو ہے پہلو میں لئے
ایسے حالات میں سب فرض ادا کون کرے

یار کہتے ہیں کہ ہنستا ہی ملے ہے عارفؔ
دل سے سرکش کے لئے سب کو خفا کون کرے

○

جب دل کو لگی تو دل والو سارے ہی طریقہ کار گئے
کوئی مکر و ریا سے جیت گیا ہم عشق بھی کر کے ہار گئے

یہ بازیٔ دل کوئی کھیل نہیں، یہ دل کی جان کی بازی ہے
یاں عشق و محبت ، مہر و وفا ہے سب تیشے بیکار گئے

جب جوبن تھا تو اپنے لئے تھی ساری خدائی ہیچ میاں
اب پوچھتے ہو کیا ماضی کی، ہم کو تو زمانے مار گئے

اک حرفِ تمنا کہہ بیٹھے اُس شوخ ادا کی خدمت میں
محفل سے اُن کی یوں نکلے کہ سیدھے سوئے دار گئے

تم عشق کہو یا کمزوری ، جو کچھ بھی کہو تم جی چاہے
ہے اصل حقیقت اِتنی سی اے صاحب جی ہم ہار گئے

اے عارفؔ جی اب چھوڑو بھی ، کیا رام کہانی لے بیٹھے
جب وقت نے چہرہ پھیر لیا پھر غم کیسا کہ یار گئے

○

یار کی دید سے بڑھ کر کوئی سوغات نہیں
پیار کے کھیل میں مر جانا بڑی بات نہیں

پیار کا کھیل نرالا ہے ذرا دیکھ کے کھیل
کوئی بھی موڑ نہیں ایسا جہاں گھات نہیں

تجھ سے دوری ہے تو زنداں ہے زمانہ سارا
جب سے دیکھا ہے تمہیں اپنی کوئی ذات نہیں

میں تجھے کیسے کہوں میرے صنم آ جاؤ
میرے رستے میں مہکتے ہوئے باغات نہیں

چھوڑو ، جانم جی! کہانی یہ ذرا اور سی ہے
تیرے سینے میں سلگتے ہوئے جذبات نہیں

میں ترے پیار کو رسوا نہیں ہونے دوں گا
میں ہوں شہباز ، کوئی کرگسِ بد ذات نہیں

تیرے عارفؔ کا تو مقصود ہے اک نظرِ کرم
پیار مانگا ہے کوئی ارض و سماوات نہیں

○

یاد ہر سانس میں سمائی ہے
بس تیرے نام کی دُہائی ہے

چپ جو رہتا ہوں سانس رُکتی ہے
بات کرتا ہوں تو خدائی ہے

آج دل میں ہے دل میں کچھ نہ رہے
آج غم کی بہار آئی ہے

تیرے اس شہر کے مکینوں نے
ظلمی تیری ادا ہی پائی ہے

دور جا کے بھی تجھ سے دیکھ لیا
دوریوں میں بھی جگ ہنسائی ہے

جس قدر تجھ کو بھولنا چاہا
یاد بن کر تُو اتنا چھائی ہے

تُو ہی تُو ہے میں جس طرف دیکھوں
حُسن نے راس یوں رچائی ہے

حُسن تیرا ہے الاماں ، توبہ
ہر ادا حُسن آزمائی ہے

سوچتا ہوں کہاں میں جاؤں گا
ایک تجھ سے ہی آشنائی ہے

زندگی کی ہے شام ڈھلنے کو
یوں جدائی میں بھی جدائی ہے

اب تو آجاؤ اے صنم دیکھو
موت آنکھوں میں ڈبڈبائی ہے

بھولنا تیرا اپنے عارفؔ کو
بے وفائی ہے بے وفائی ہے

○
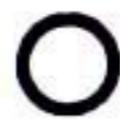
جب اجنبی سے بن کے سرِ راہ گزر گئے
ہم بھی وہاں نہ ٹھہرے اور کوچ کر گئے

پھر یوں ہوا کہ ہم نے محبت کی بار ہا
یوں جتنے کارنامے تھے، وہ اُن کے سر گئے

اللہ کرے جفا کا تیری سلسلہ دراز
اپنے تو صبر کے سبھی پیمانے بھر گئے

کیسے چلے گا جانِ وفا کاروبارِ حسن
سنتے ہیں تیرے شہر کے دیوانے مر گئے

وہ ایسا تیزگام تھا جانے کدھر گیا
ہم ایسے سست رو تھے کہ خود سے بچھڑ گئے

راہِ وفا میں جانے وہ کیا واقعہ ہوا
عارفؔ وفا کے نام سے خوابوں میں ڈر گئے

○

یوں نہ ہر در پہ سر کو ٹکراؤ
اس سے بہتر ہے گُھٹ کے مر جاؤ

سر پہ جب آ پڑی تو جانِ جہاں
پھول بن جاؤ اور بکھر جاؤ

یا تو خود گھونسلا جلا ڈالو
شام ہوتے ہی ورنہ گھر جاؤ

تیری یہ مہربانیاں توبہ
اب تو بہتر ہے تم بچھڑ جاؤ

حکم لکھا تھا ہاتھ پر عارفؔ
رزق ہے اُس طرف ، اُدھر جاؤ

O

اے فلک ، اب تو تیرا سارا عناد مٹ گیا
کل جو گھر تھا دیکھنے میں شاد باد مٹ گیا

دوستو! خوشیاں مناؤ، دشمنو! ماتم کرو
دل میں تھا جو گلستاں آباد مٹ گیا

وقتِ رخصت اِس ادا سے مجھ کو وہ دیکھا کیے
میرے جانے سے یہاں سارا فساد مٹ گیا

ہو مبارک شہر کے لوگو تمھیں یہ حادثہ
دیکھتے ہی دیکھتے اِک نامراد مٹ گیا

تم رہو شاداں کہ عارفؔ ہار کے دل چل دیا
سوچنا اُس شخص کو جو دے کے یاد مٹ گیا

○

آج اک بھولے ہوئے شخص کی یاد آئی ہے
میری ہر سانس میں اک مستی سی لہرائی ہے

میں خیالوں میں بہت دور تلک جا پہنچا
میں ہوں اور ساتھ میرے پیکرِ رعنائی ہے

ہر طرف دور تلک جشنِ بہاراں ہے بپا
اور ہر لمحہ کہ اک گونجتی شہنائی ہے

اُس کی ہر جنبشِ لب کلیوں کا چٹکنا جیسے
اُس کی ہر ایک ادا ٹوٹتی انگڑائی ہے

میری خواہش ہے کہ جاں اُس پہ نچھاور کر دوں
اور وہ عارفؔ کو مٹانے کا تمنائی ہے

○

اس کڑی دھوپ میں ہی گھر سے نکلنا ہوگا
ورنہ بچوں کو تیرے بھوک سے مرنا ہوگا

یا میرے دیس کے مظلوموں کو سایہ دے دو
ورنہ اس دیس کے ہر شخص کو جلنا ہوگا

اِتنے عادی ہیں میری نرمئی گفتار کے وہ
داورِ حشر تجھے لہجہ بدلنا ہوگا

ہم تجھے شہر حوادث میں تحفظ دیں گے
تجھ کو اخلاص کی تلوار پہ چلنا ہوگا

کمر بستہ ہیں سرِ دار سجانے پہ رقیب
دردِ دل تجھ کو بھی اب حد سے گزرنا ہوگا

عشق کے راستے اتنے بھی نہیں نرم و گداز
وقت آنے پہ تجھے دار پہ چڑھنا ہوگا

تجھ کو گر جینا ہے اس درد بھری دنیا میں
اپنے اندر کے ہی انسان سے لڑنا ہوگا

کج ادائی مری بے شک نہ تجھے اچھی لگے
اب سفر تجھ کو میرے ساتھ ہی کرنا ہوگا

شمع بن کر نہ یوں آیا کرو محفل میں
ورنہ پروانوں کو ہرگام پہ جلنا ہوگا

چھوڑ کر جا تو رہا ہوں میں تیرا شہر ندیم
جانتا ہوں کہ مجھے خود سے بچھڑنا ہوگا

خامشی راس نہیں دل کو اے عارفؔ کہہ دو
وہ جو آئے تو اِسے خوب مچلنا ہوگا

○

خونِ جگر کو سوچ کے اندر اتار کے
لکھے ہیں ہم نے شعر کچھ یوں تیرے پیار کے

آتے سمے لگایا ہے رُخسار پر جو تِل
اچھا کیا وہ آئے نظر کو اُتار کے

مُطرب نے اضطراب میں سُر ہی بھلا دیے
جب آ گئے وہ بزم میں زُلفیں سنوار کے

وہ کتنی بار روٹھا، میں رویا ہوں کتنی بار
چھوڑو جی سلسلے یہ حساب و شمار کے

جاؤ وہیں گزارو خزاں کے سمے بھی تم
جس دیس میں گزارے ہیں دن بہار کے

ہے آرزو کہ دیکھوں چمکتا ترا شباب
مانگے ہیں چار روز خدا سے اُدھار کے

کچھ امتحان اور وفاؤں کے نام پر
عارفؔ کچھ اور معجزے ہوں انکسار کے

○

کس قدر دلفگار کی شب ہے
جو تیرے انتظار کی شب ہے

رات بھر خود سے میری جنگ رہی
اس دلِ بے قرار کی شب ہے

آج اِس دل کا خون واجب ہے
یہ تیرے اختیار کی شب ہے

آج ساقی نے مہربانی کی
آج اِس بادہ خوار کی شب ہے

آج اشکوں میں ڈوبنا ہوگا
دیدۂ اشکبار کی شب ہے

صبح تک صبر کر ذرا عارفؔ
آخری اعتبار کی شب ہے

○

شبِ وصل پر بھی تھے ہجراں کے سائے
نہ وہ کھل کے روئے نہ ہم مسکرائے

میں خود کو جلا کر چراغاں کروں گا
وہ جانِ تمنا اگر لوٹ آئے

تری یاد کا اک دیا ہے فروزاں
کوئی غم کی آندھی نہ اس کو بجھائے

میں اپنے غموں سے ہراساں نہیں ہوں
خدا تم کو لیکن نہ یہ دن دکھائے

ہے اتنی سی میری تمنا کہ عارفؔ
دلوں میں محبت کی بستی بسائے

○
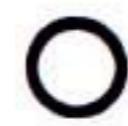
ذرا سا شہر نگاراں سے میں گزر کر لوں
میرے خدا ذرا مہلت ، میں کچھ سفر کر لوں

اُسے اُسی سے جو مانگوں تو سُرخرو نکلوں
یہ آرزو ہے مگر خود کو معتبر کر لوں

خدا کی قسم اگر ساتھ دے میرا ہم دم
تیرے نگر کی سبھی چوٹیاں میں سر کر لوں

اگر عطا ہو محبت تو پھر اے جانِ بہار
تمہارے نام پر یہ زندگی بسر کر لوں

خدا نے مجھ کو دیا ہے وصف دلنوازی کا
کہ میں جو دشت میں بیٹھوں تو اِس کو گھر کر لوں

جلا کے میرا گھروندا ، مٹا کے میرا نشان
مجھے یہ حکم ملا ہے کہ درگزر کر لوں

ذرا کو روک لو یہ سلسلہ مظالم کا
ذرا سمیٹ لوں خود کو ذرا گھر کر لوں

○

پھٹی ہیں ردائیں ، شکستہ قبائیں
جو ذوقِ نظر ہو تو تشریف لائیں

میں خود کو جلاتا ہوں تم گنگناؤ
چلو رقصِ بسمل پہ نغمہ سنائیں

نہ نفرت کرو تم بھی اہلِ وفا سے
بُرے ہی سہی ہم ، کبھی آزمائیں

اے ساقی پلادے ہمیں آج اتنی
سبھی غم زمانے کے ہم بھول جائیں

سنا ہے بڑی تم کو مشقِ ستم ہے
جو شوقِ ستم ہے تو زحمت اُٹھائیں

میں ناکام ہوں اس جہاں کی نظر میں
مگر مجھ کو عارفؔ ہیں لاکھوں دعائیں

○

کسی غمگیں کہانی کا کوئی کردار لگتا ہے
جسے دیکھو وہی خود سے ہمیں بیزار لگتا ہے

یہی بہتر ہے رستے کا کوئی زادِ سفر لے لیں
کہ پیارے زندگی کا راستہ پُر خار لگتا ہے

غمِ دل ہے، غمِ جاں ہے، غمِ دنیا، غمِ جاناں
جو دیکھوں عمرِ رفتہ کو تو اک اخبار لگتا ہے

ذرا ٹھہرو اے میرے ہم نشینو! تھوک دو غصہ
جدھر سے تیر آیا ہے اُدھر غم خوار لگتا ہے

کہو عارفؔ سے جا کے زندگی کو زندگی سمجھے
کہ اس کا اسطرح جینا ہمیں دشوار لگتا ہے

O

گو عید کا ہے روز مگر دل اداس ہے
شاید وہ لوٹ آئے یہی ایک آس ہے

طوفان کوئی شاید فضاؤں میں ہے چُھپا
آوازِ طائراں میں جو خوف و ہراس ہے

دل اب بھی کہہ رہا ہے قدم پھونک پھونک رکھ
شاید وہ بدنصیب کہیں آس پاس ہے

شاید اسی کے دم سے نئی داستاں بنے
دیوانہ آج پھر سے بڑا بدحواس ہے

جب چار یار ساتھ تھے تو سر بلند تھا
اب خود کا ہوش ہے نہ کسی کا حواس ہے

کیا کچھ نہیں دیا ہے غفور رحیم نے
لیکن تو اُس کریم کا بھی ناسپاس ہے

اب سادگی کو چھوڑ ، کوئی چال وال چل
عارفؔ ترا رقیب زمانہ شناس ہے

○

اس طرح پیش نہ آیا کرو دیوانوں سے
روز یہ لوگ تو آتے نہیں ویرانوں سے

دل کے مہماں نہ سہی، تھوڑے شناسا تو رہے
دشمنی ایسی بھی کیا، ہم سے پریشانوں سے

میرے مالک تو میرا ظرف ذرا اور بڑھا
تیر کچھ اور چلے آتے ہیں یارانوں سے

کون کہتا ہے شرابوں نے بُھلا دیں یادیں
غم ہی کچھ اور بڑھا اپنا تو پیمانوں سے

یہ مقدر ہے سبھی تہمتیں عارفؔ پہ لگیں
کیسا شکوہ یا گلہ اپنے مہربانوں سے

○

کیسا شکوہ یا گلہ وعدے جو وفا ہو نہ سکے
ہم سے آدابِ محبت ہی ادا ہو نہ سکے

تم مسیحا ہی سہی سارے زمانے کے مگر
عشق وہ روگ ہے جس کی دوا ہو نہ سکے

دل کے ٹکڑوں کو سمیٹوں تو تیری بات سنوں
اتنا کافی ہے کہ ہم تم سے خفا ہو نہ سکے

آہ! یہ دورِ پریشاں بھی گزر جائے گا
سب وہ کر ڈالو کہ پھر اس سے سوا ہو نہ سکے

تم نے کیا کیا نہ کیا، ہم نے کیا کیا نہ سہا
یہ تو اعصاب تھے عارفؔ کے ہوا ہو نہ سکے

○

اس طرح سے نہ ہمیں ہجر کی تنہائی دو
تھوڑا دیدار کرا دو ہمیں بینائی دو

ہم تمہیں اپنے مقدر میں سمو لیں گے صنم
بس ذرا سا ہمیں اذنِ شناسائی دو

ہم سے ملنے کو تمہیں دور نہیں جانا ہے
بس ذرا ذہن کو دل اُوٹ رُشنائی دو

کون جائیگا کسی اور کے در پر جاناں
اپنے بسمل کو اگر تم ہی مسیحائی دو

ہم کو دنیا کے بکھیڑوں نے ستا رکھا ہے
اُن کی خواہش ہے کہ ہر وقت پذیرائی دو

دل کی وادی میں سکوں موت ہے میرے عارفؔ
دل کے زخموں کو ذرا پھر سے تو انگڑائی دو

○

ہوش کے لمحے بھی محوِ جام ہو کر رہ گئے
آدمی ہم خاص تھے پر عام ہو کر رہ گئے

دیکھتا ہوں روز میں اس وقت کی نیرنگیاں
صبح جیسے لوگ کیسے شام ہو کر رہ گئے

دل تمہارا ہو گیا تو ہم تمہارے ہوگئے
یوں تمہاری چاہ میں بے نام ہو کر رہ گئے

پیار تو اک کھیل تھا تیرے لئے جانِ وفا
ہم ہی پاگل تھے تمہارے نام ہو کر رہ گئے

آسماں بھی رو پڑا تُربت پہ اس ناکام کی
بعد مرنے کے بھی ہم الزام ہو کر رہ گئے

دل لگی کے شوق میں دل کا گنوانا یاد ہے
عشق کے بازار میں نیلام ہو کر رہ گئے

○

دیوانہ ہوں پاگل ہوں ، شفا ڈھونڈ رہا ہوں
بیماریٔ دل کی بھی دوا ڈھونڈ رہا ہوں

لاکھوں ہی صدائیں ہیں فضاؤں میں مگر میں
اپنے ہی پیاروں کی صدا ڈھونڈ رہا ہوں

اے شہرِ نگاراں تری ہر چیز بکاؤ
میں مفت میں الفت کی ادا ڈھونڈ رہا ہوں

اس عشق و محبت نے یوں برباد کیا ہے
ٹوٹی ہوئی اپنی انا ڈھونڈ رہا ہوں

کس بات پہ عارفؔ کو بھلا چھوڑ دیا ہے
دیوانہ ہوں اپنی ہی خطا ڈھونڈ رہا ہوں

O

میرے بھی دل کی پہلے سی حالت نہیں رہی
شائد انہیں بھی مجھ سے محبت نہیں رہی

غیروں کی محفلوں میں وہ سرشار ہیں بہت
شائد اب اُن کو میری ضرورت نہیں رہی

کچھ اس طرح ستایا غمِ روزگار نے
دل کے معاملات کی فرصت نہیں رہی

اپنوں کی جب سے دیکھی ہیں ہم نے رفاقتیں
غیروں سے اب ذرا بھی کدورت نہیں رہی

شائد متاعِ زیست کو میں خرچ کر چکا
آنکھوں میں اب وہ پہلے سی وحشت نہیں رہی

سنتے ہیں اب وہ چلتا ہے پیچھے رقیب کے
پہلی سی روٹھنے کی وہ عادت نہیں رہی

مانا کہ اور سب تو عارفؔ جی پالیا ہے
لیکن تیرے نصیب میں الفت نہیں رہی

○

چھپائے پھر رہا ہے جو بھی خود کو اپنی عزت میں
جھکا دے سر یہاں اپنا، پڑے گا ورنہ زحمت میں

یہاں پہ چھین لی جاتی ہیں سانسیں اللہ والوں کی
جسے بھی زعم ہو رب کا وہ جائے اس کی رحمت میں

سبھی رب کی رضا والے چھپے بیٹھے ہیں غاروں میں
کہ اب شیطان کے چیلے یہاں ہیں خوب شہرت میں

الٰہی اور کتنا جبر کا یہ دور باقی ہے
ہزاروں سر کٹا بیٹھے ہیں اب تک تیری الفت میں

یہ مانا وقتِ آخر پہ تو حق ہی سُرخرو ہو گا
مگر شیطان بڑھتے جا رہے ہیں اپنی طاقت میں

یہ دورِ ناگہانی ہے یہاں ایسا بھی ممکن ہے
کہ وہ سر کاٹ کر رکھ لیں ہمارا بھی محبت میں

جو اُن کو مہرباں دیکھا تو عارفؔ سہم کر بولا
غنیمت ہے جو زندہ ہیں تیرے اس دورِ ظلمت میں

O

اگر ہے زُعم تو پھر زور آزما کے دکھا
صبا خرام ذرا ہم سے دور جا کے دکھا

ہم آئے بیٹھے ہیں در پر کسی صدا کے بغیر
نہیں جو ہم سے تعلق تو پھر اُٹھا کے دکھا

دوائے دل ہے تیرے پاس تو بھی واقف ہے
مریضِ دل کو ذرا دل سے تو مٹا کے دکھا

چلیں جی مان لیا حسن تو ہے بے پرواہ
مگر یہ عشق ہے اس کو ذرا بھلا کے دکھا

تمہارے واسطے عارفؔ کہاں وہ بدلیں گے
بدل کے خود کو اُس آنکھ میں سما کے دکھا

○
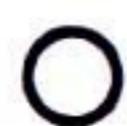
سونی سونی دل کی بستی جانے کیوں طاری ہے سوگ
کون اٹھائے اس کے غم کو اس کے ہیں اپنے ہی روگ

جب بھی چھائیں گھور گھٹائیں ، یوں تڑپے کہ مر ہی جائے
کون بتائے اس پگلے کو یہ تو ہیں سب اس کے بھوگ

آؤ سب کچھ بھول ہی جائیں اپنی بستی اور بسائیں
جانے کب تک یوں بیٹھو گے ، چھوڑ بھی دو اب اپنا جوگ

رونا دھونا چھوڑ کے میں نے ہنستا چہرہ پہن لیا ہے
جب سے اُس نے مجھ سے کہا ہے یونہی تھے اس کے سنجوگ

ہنستا چہرہ ، روتی آنکھیں یہ باتیں ہیں دل والوں کی
عارفؔ تم پر کیا بیتی ہے کب سمجھیں فرزانے لوگ

○

ترچھی نظروں سے جگر چیر کے جانے والا
کیسا انداز ہے ظالم کا ستانے والا

مجھ کو حالات نے دیوار میں چن رکھا تھا
دوسرا ڈھونڈ لیا اُس نے بھی چاہنے والا

میں وفاداریِ و جانبازی پہ نازاں تھا مگر
اور اُس کا بھی رویہ تھا زمانے والا

سوچ لو اہلِ وفا شہر اگر چھوڑ گئے
کون آئے گا تیرا ظلم اُٹھانے والا

اس قدر ظلم و ستم ، خود کو چھپا لو لوگو
آسمانوں سے کڑا حکم ہے آنے والا

اب بھلا کون تجھے چاہے گا دھڑکن کی طرح
اب تیرے شہر سے دیوانہ ہے جانے والا

یہ تو عارفؔ کا مقدر ہے کہ یہ زندہ ہے
اس کا محبوب تو ہے رحم نہ کھانے والا

○

کھلا کے پھول کو ، پھر پھول مسکراتی ہے
بس ایک ماں ہے جو بے مول مسکراتی ہے

بھلے ہو جیسا بُرا گھر سے رابطہ میرا
وہ چاہتوں کا لئے پھول مسکراتی ہے

بہت ہی اچھا کیا اُس نے مجھ کو چھوڑ دیا
کہ میرے گھر میں تو بس دھول مسکراتی ہے

اگر ہے تم میں بھی قوت خرید لو اس کو
نہ دو اس بات کو تم طول مسکراتی ہے

میں کیسے جاؤں سرِشام گھر کو اے عارفؔ
کہ میرے گھر میں میری بھول مسکراتی ہے

○

تمہیں ہے شوق اگر ہم کو آزمانے کا
ہمیں بھی شوق ہے جور و ستم اُٹھانے کا

جو ہو سکے تو یہ دردِ دل بُھلا ڈالو
بڑا ہے ذوق تیرا محفلیں سجانے کا

خدا کے بعد یہ بندہ خدا بھی یاد رہے
کھلا ہے اب تلک رستہ بھی لوٹ آنے کا

ہمیں سے سیکھ کے آدابِ میکدہ دیکھو
ہمیں بتاتے ہیں رستہ شراب خانے کا

چلو جی آج سے عارفؔ بدل دو اپنا نصاب
نہیں ہے وقت تیرے پاس کچھ بتانے کا

○

کہنے والے تو گئے جانے کہاں ہم کیا کریں
لوگ گر جان گئے سرِ نہاں ہم کیا کریں

آپ کے اپنے کوئی ذاتی مقاصد تو نہیں
آپ ہیں اتنے جو ہم پر مہرباں ہم کیا کریں

دل کی بازی میں سبھی لوگ ہیں گھبرائے ہوئے
دل نے تم کو بھی کیا ہے پریشاں ہم کیا کریں

غیر کی باتوں پہ تم بھی تو ہمیں جھٹلا گئے
اب ہوئے ہو ہر کسی سے بدگماں ہم کیا کریں

ہم کو تو قربت کے لمحے ہی نہیں حاصل رہے
پھر اگر بن کے رہو جانِ جہاں ہم کیا کریں

ہم مسافر ہیں نہ جانے ہم کہاں پر جا بسیں
اور کل ہم کو نہ پاؤ تم یہاں ہم کیا کریں

رند تو سب جا چکے ہیں میکدے کو چھوڑ کر
ہم تھے محفل کے کبھی روحِ رواں ہم کیا کریں

آنکھ سے بھاتا نہیں جو شخص تم کو ایک پل
وہ کھلا دے آنکھ میں اک گلستاں ہم کیا کریں

ایک عارفؔ کے سوا تیرا کوئی عاشق نہیں
تم کو ہم پر ہے اگر ایسا گماں ہم کیا کریں

○

شہر بتاں میں دھوم مچی ہے ، اک دن جا کر دیکھو جی
دل کا زیاں تو طے ہے واعظ ، خود کو بچا کر دیکھو جی

جن راہوں پہ اکثر جانم تم آتے ہو جاتے ہو
اُن راہوں میں ہم بھی کھڑے ہیں آنکھ اُٹھا کر دیکھو جی

آنکھوں میں وحشت بھی کم ہے، جسم بھی کچھ کچھ ڈھلک گیا ہے
چھوڑو اس بنجارہ پن کو کمر ٹکا کر دیکھو جی

دھیرے دھیرے وقت کا دامن سرک رہا ہے ہاتھوں سے
کیا کچھ آگے بھیج چکے ہو کھوج لگا کر دیکھو جی

کا ہے عارفؔ منت کش ہو ظلم کے ان ایوانوں کے
ایک ہی در کافی ہے اُس پر سر کو جھکا کر دیکھو جی

○

ٹھیک کہتے ہو کہ اتنے بھی وہ دلدار نہ تھے
ہم مگر سنگِ ملامت کے سزا وار نہ تھے

اس جہاں میں بھلا کس کو بناتے رہبر
راہ رو ہم بھی تھے لیکن یوں طرف دار نہ تھے

جب چراغوں میں اُجالا ہی رہا نہ باقی
پھر یہ احساس ہوا یار بھی غم خوار نہ تھے

جس قدر ترکِ تعلق کی ہے ٹھانی ہم سے
پیار کے شہر میں اتنے بھی گناہگار نہ تھے

ایک بیمار ہنسی ہنستے ہوئے کہنے آئے
جتنا سمجھا تھا تمہیں اتنے بھی بیمار نہ تھے

جھوٹ ہو کاش ہمارا یہ گماں بھی جاناں
غیر کو تم نے بتایا ہے وفا دار نہ تھے

کوئی پوچھے جو تمہیں چھوڑا ہے کیوں عارفؔ کو
ان سے کہہ دینا کہ وہ صاحبِ کردار نہ تھے

○
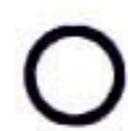
شوق کتنا تھا تجھے اُس کے لئے مرنے کا
جو یہ کہتا تھا کہ اب وقت نہیں لڑنے کا

مان جا اُس نے تجھے چھوڑ دیا ہے راہ میں
اب بھی موقع ہے اے دل! اُس سے جدا ہونے کا

لوٹ آنا ہے اُسے یہ ہے مقدر لیکن
وقت ہوتا ہے کسی زخم کے بھی بھرنے کا

یہ زمانہ ہے یہیں ہوگا مکافاتِ عمل
کام یہ مالک و خالق ہی کے ہے کرنے کا

وقت کو چھوڑ دے اب اُس کی ڈگر پر عارفؔ
دیکھ کیسا یہ تماشا ہے جگر جلنے کا

O

وہ دیکھو مفلسی سے مر رہا ہے
جو اپنی ذات میں اک شہنشاہ ہے

یہ پھر کس پہ ستم ٹوٹا ہے یا رب
یہ کس آفت رسیدہ کی صدا ہے

مجھے احساسِ محرومی دیا کیوں؟
مجھے بس تجھ سے یا رب یہ گلہ ہے

خزانے نفرتوں کے مِل گئے ہیں
میری الفت کا یہ کافی صلہ ہے

کہیں وہ سادہ پیکر مل تو جائے
پھر اُس سے پوچھوں میرا کیا پتا ہے

اندھیرے اس قدر چاروں طرف ہیں
نظر آتا نہیں جو راستہ ہے

ذرا بتلا کے یہ تسکین کر دے
غریبوں کا بھلا تو ہی خدا ہے

وہ آ کر خواب میں کیسے ملیں جی
کہ عارفؔ رات بھر تو جاگتا ہے

○

آج کل سنتے ہیں مصروفِ فغاں ہوتے ہیں
بات ہنسنے کی بھی ہو اشک رواں ہوتے ہیں

شکوہ کرتے ہیں زمانہ ہی برا ہے اب تو
یار تو ملتے ہیں دلدار نہاں ہوتے ہیں

اب کہاں ملتے ہیں چاکانِ گریباں ہمدم
دل کے سودوں میں بھی اب سود و زیاں ہوتے ہیں

کون یاں سر کو ہتھیلی پہ لئے پھرتا ہے
کب ترے شہر میں ہم جیسے جواں ہوتے ہیں

یاد کرتے ہیں وہ گزرے ہوئے ایام کو یوں
رو کے کہتے ہیں کہ عارفؔ جی کہاں ہوتے ہیں

○

شب کے اختر شمار کر لیتا
میں تیرا انتظار کر لیتا

تو امیدوں میں رنگ تو بھرتا
میں تیرا اعتبار کر لیتا

وہ مقابل جو آگیا ہوتا
ہار میں اختیار کر لیتا

یہ تو دل کی لگی کا سودا تھا
میں خزاں کو بہار کر لیتا

وہ میرے ساتھ چلتا تو
جوئے خوں کو بھی پار کر لیتا

تو نے عارفؔ جی دل ہی چھوڑ دیا
ورنہ ساقی اُدھار کر لیتا

○

رنج سے آنکھیں ملا کر دیکھئے
پھر سے گلشن میں تو جا کر دیکھئے

گائیں گے پنچھی تمہارے گیت بھی
اُن کو ساتھی تو بنا کر دیکھئے

حال بھی کتنا طرب انگیز ہے
دل سے ماضی کو بھلا کر دیکھئے

دیکھنا پھر وحشتوں کو رقص میں
بس ذرا سا مسکرا کر دیکھئے

بے وفا عارفؔ ہو یہ ممکن نہیں
ہر طرح سے آزما کر دیکھئے

○

دوستو! دوستی کی بات کرو
کوئی تو دل لگی کی بات کرو

زہر گھولو نہ تم خوشامد کا
اتنی نہ عاجزی کی بات کرو

کچھ تو اپنا ہنر بھی دکھلاؤ
پھر میری بے بسی کی بات کرو

میں نے کتنے فریب کھائے ہیں
راہبرو! رہبری کی بات کرو

ذکر چھوڑو پرانی راتوں کا
کچھ نئی روشنی کی بات کرو

الجھی باتیں تو ہو چکیں ساری
اب ذرا سادگی کی بات کرو

بیتی باتوں کا ہو چکا نوحہ
اب تو عارفؔ خوشی کی بات کرو

○

زندگی پھول ہو یا کانٹے ہوں
بس مقدر میں ہی نہ گھاٹے ہوں

ایسی اک رہگزار کو ڈھونڈو
بے بسی کے نہ جس میں کانٹے ہوں

کوئی اک بھی مثال پیش کرو
خار بوئے ہوں پھول کاٹے ہوں

اس زمانے میں ایسا نا ممکن
یار لوگوں نے درد بانٹے ہوں

ایسی دنیا کا کیا کریں عارفؔ
بات اونچی ہو لوگ ناٹے ہوں

○

جب بھی اے دوست کبھی کالی گھٹا چھائے ہے
دل میں چپکے سے تیری یاد کو مہکائے ہے

جب سیاہ رات ہو اور چاند نکلتا دیکھوں
تیرے آنے کی ادا یاد میں مُسکائے ہے

جب چلے باد صبا ، کلیوں کو چٹکتے دیکھوں
تیرے ہنسنے کی ادا آنکھ میں لہرائے ہے

جب بھی پھولوں پہ میں بلبل کو چہکتے پاؤں
تیری آواز مرے کانوں کو بہکائے ہے

جب بھی یادوں کے سمندر سے نکلنا چاہوں
تیری یادوں کی لہر مجھ کو ڈبو جائے ہے

کون آئے گا منانے کبھی روٹھے تو
ہاں یہی سوچ ہے جو جان میری کھائے ہے

تیرے عارفؔ کی صدا ہے کہ صنم لوٹ آؤ
آخری وقت ہے اور موت چلی آئے ہے

○

بس اتنی روشنی کر دو کہ دل پروانہ ہو جائے
اندھیرا کچھ تو چھٹ جائے یہ دل دیوانہ ہو جائے

کہیں جا کر گرے بجلی، تو دل سے ہوک اٹھتی ہے
میرا دل اس طرح مچلے کہ بس غم خانہ ہو جائے

کچھ ایسے راستے ڈھونڈو کہ میں تڑپا کروں اُن میں
جو میرا آشیانہ ہے وہی ویرانہ ہو جائے

کہیں تو زندگی کی ہاؤ ہو کا سلسلہ دیکھو
درِ مندر نہیں اچھا تو پھر میخانہ ہو جائے

کہیں سے بے وفا ڈھونڈو جو عارفؔ میرا دل توڑے
کرے وعدے وفاؤں کے، مگر بیگانہ ہو جائے

○
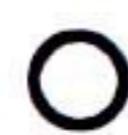
بدلے بدلے سے تیرے اندازِ پذیرائی ہیں
تم کو معلوم تھا ہم ایسے ہی ابلائی ہیں

وقت کی بات ہے جو آپ کے شیدائی ہیں
آپ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہے ہرجائی ہیں

وہ جو انداز میرے پیار کے مظہر تھے کبھی
آج اُس بت کے لئے باعثِ رسوائی ہیں

ہم سے کہتے ہو تیرے نام ہے جینا مرنا
کتنے دلکش یہ تیرے اندازِ شکیبائی ہیں

تیری ہر بات میں تو صرف اداکاری ہے
سارے انداز تیرے فقط ڈرامائی ہیں

یاد رکھنا کہ ہمیں یاد کرو گے اک دن
آج عارفؔ کو یہ کہتے ہو کہ سودائی ہیں

○

کہنے کی بات آج بھی ان سے کہی نہیں
عادت بری ہے لیکن اب تک گئی نہیں

چل پھر سے اہتمامِ ملاقات کر ہی لیں
مِٹ جائے اختلاف یہ خواہش بُری نہیں

یاروں کے اعتبار پہ وہ خوار ہوگیا
جس نے کسی کی بات کبھی بھی سہی نہیں

بس اس دفعہ تمہارا ذرا زور چل گیا
چرخِ کہن یہ بات ذرا بھی نئی نہیں

عارؔف وہ کیوں اُٹھائیں گے آ کر تمہارے ناز
پہلی سی کوئی بات تو تم میں رہی نہیں

○

آنسوؤں سے چہرے کو دھونا نہیں
وقت کی گردش میں اب کھونا نہیں

یاد ہیں مجھ کو جنوں کی وحشتیں
انتظارِ یار میں سونا نہیں

یہ روایت عشق تک محدود ہے
سر کٹا کر بھی خفا ہونا نہیں

خواہشِ فصلِ گُلِ تر خوب ہے
کاٹنا کیسا اگر بونا نہیں

بے وفا شائد نہ ہو مجبور ہو
آہ عارفؔ صبر کر رونا نہیں

○

کیا وہ دن تھے ہم کبھی پُرنم نہ تھے
کیا زمانہ تھا کہ غم بھی غم نہ تھے

چھوڑ کر ہم کو سرِ راہ چل دیے
یہ بھی کافی ہے کہ وہ برہم نہ تھے

محفلیں اُن کی یونہی سجتی رہیں
فرق یہ کہ اُن میں شامل ہم نہ تھے

ٹوٹ کر آنکھوں سے تارا گر گیا
آسمانوں پر ستارے کم نہ تھے

آہ عارفؔ داستاں کہتے رہے
مڑ کے دیکھا تو وہاں جانم نہ تھے

○

بے گناہی بنی الزام تو رونا آیا
تہمتیں جب لگیں ہر گام تو رونا آیا

سارا دن جان بہ لب بیٹھے رہے آس میں ہم
آخرش ڈوب چلی شام تو رونا آیا

اُس نے بھی چھوڑ دیا، ہم نے تقاضا نہ کیا
ہاتھ سے چھین لیا جام تو رونا آیا

رند بیٹھے تھے کہانی بھی کوئی عشق کی تھی
اس کہانی میں نہ آیا جو ترا نام تو رونا آیا

آہ عارفؔ جی بڑے سرکش و سرشار تھے تم
ہم نے دیکھا تیرا انجام تو رونا آیا

○

دامنوں سے یوں الجھنا چھوڑ دو
ٹوٹ جاؤ گے، اکڑنا چھوڑ دو

منزلیں آسان ہو جائینگی سب
بس کوئی منزل بنانا چھوڑ دو

رنج ہو جائے گا راحت ایک دن
رنج میں آنسو بہانا چھوڑ دو

ہر جفا کو عارضی ہی پاؤ گے
بس ذرا جی کو جلانا چھوڑ دو

اُن کا غصہ بھی ہوا ہو جائے گا
بس ذرا اُن کو منانا چھوڑ دو

○

اور کتنا حساب باقی ہے
یعنی کتنا عذاب باقی ہے

مانا جنت ہے تیری یہ دنیا
اور کتنا ثواب باقی ہے

ساتھ اس کا ہے اک عذاب مگر
اب بھی آنکھوں میں خواب باقی ہے

حوصلے بھی جوان ہیں اپنے
جام میں بھی شراب باقی ہے

تیری باتیں بجا سہی لیکن
دل جو خانہ خراب باقی ہے

مان لیں گے تری بھی اے ناصح
چند روزہ شباب باقی ہے

بس میرے دوست اتنا کافی ہے
آنکھ میں کچھ حجاب باقی ہے

ہنس کے ملتا ہے راہ میں عارف
یوں روایت کی آب باقی ہے

O
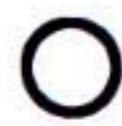
غم گساروں سے محبت کرنا
ان نظاروں سے محبت کرنا

یہ بھی انداز ہے ، شکرانے کا
شہ پاروں سے محبت کرنا

ہم نے سیکھا ہے تیرے ہجر میں یار
ان ستاروں سے محبت کرنا

پیار ہو دل میں تو دل چاہے گا
اُس کے پیاروں سے محبت کرنا

آگ پیتے ہیں جو رنج و غم کی
بادہ خواروں سے محبت کرنا

شوق اچھا نہیں اے جانِ وفا
آب داروں سے محبت کرنا

نام ہو جائے گا اس میں عارفؔ
دل فگاروں سے محبت کرنا

○

گو ہمیں بھی تھی تمہاری دلکشی اچھی لگی
ہم کو اے خوباں تمہاری دوستی اچھی لگی

شوخیاں ، فرزانگی ، زندہ دلی ، بیگانگی
اے خوش ادا! ہم کو ہر اِک بات ہی اچھی لگی

وہ غیر سے ملنا تیرا ، وہ ہر قدم پر قہقہے
دل کی حالت جو بھی تھی ، پر بے رخی اچھی لگی

اک طرف جُہدِ مسلسل اک طرف سُونا سکوت
چھوڑ کر آدم کو جنت ، بندگی اچھی لگی

سب ہی عارفؔ کی کہانی شوق سے سنتے رہے
ہم کو ساری داستاں میں ان کہی اچھی لگی

○

جیؤ ، جیتے رہو سدا کیلئے
میرے الفاظ ہیں دُعا کیلئے

بے انائی میں تھا بھلا لیکن
میں تو زندہ رہا انا کیلئے

ہر قدم پر بہت مسیحا تھے
میں تڑپتا رہا شفا کیلئے

وقت برہم ہے اب تلک مجھ سے
کوئی روکے اسے خدا کیلئے

روحِ عارفؔ پہ ظلم کرتے رہو
خوب ہے آدمی جفا کیلئے

○

دل سنبھلتا ہی نہیں ہرجائی
وقت کٹتا ہی نہیں ہرجائی

نیند آتی ہی نہیں ہے یارو
صبر آتا ہی نہیں ہرجائی

کوچہ کوچہ گلی گلی ڈھونڈا
یار ملتا ہی نہیں ہرجائی

راستہ اب بدل ہی لیتے ہیں
ساتھ چلتا ہی نہیں ہرجائی

وقت ہے ہم سے خفا اے عارفؔ
ساتھ دیتا ہی نہیں ہرجائی

○

اگر خاموشی عادت ہو تو دشمن یہ جہاں کیوں ہو
اگر نہ درد ہو دل میں تو پھر لب پر فغاں کیوں ہو

حسین پھرتے ہیں گلیوں میں مرصع سارے جلوؤں سے
اگر نہ بے حجابی ہو تو پھر دل کا زیاں کیوں ہو

شکست اپنا مقدر ہے ، یہ بازی دشمنوں کی ہے
یہ سب کچھ جان کر کھیلے ، تو پھر اشکِ رواں کیوں ہو

بہت ہی بیوفا ہو تم ، ارے تم کتنے جھوٹے ہو
اگرچہ دشمنِ جاں ہو مگر پھر جانِ جاں کیوں ہو

محبت ایک سپنا ہے ، محبت ایک دھوکہ ہے
اگر برباد ہونا ہے تو پھر نام و نشاں کیوں ہو

مجھے گلشن سے جانے دو ، مجھے ویرانہ بہتر ہے
جہاں بجلی کو گرنا ہے ، وہ میرا آشیاں کیوں ہو

جبیں پونچھو ، وفا چھوڑو ، کہیں اب اور چلتے ہیں
اگر سجدے ہی کرنے ہیں تو پھر یہ آستاں کیوں ہو

ہمیں زنداں میں رہنے دو ، ہمیں اُڑنا نہیں عارف
اگر پرواز مشکل ہے ، فضائے بیکراں کیوں ہو

○

اب وہ پہلی سی آن بان نہیں
اب ذرا سی بھی تن میں جان نہیں

وقت آخر یہ سوچنا کیسا
بے زمینی ہے آسمان نہیں

وہ بھی آنے کا کہہ کے بھول گیا
کوئی اُس جیسا بے دھیان نہیں

روز آغوشِ نو میں گر جانا
اے محبت تیری یہ شان نہیں

وہ وفا کو جفا سمجھتا ہے
کوئی عارفؔ سا بد گمان نہیں

○

ماضی ، یادیں ، بہار کی باتیں
یاد ہیں! تم کو پیار کی باتیں

وہ ترے قول و قرار کا رونا
وہ مرے انتظار کی باتیں

وہ ترا روز غیر سے ملنا
وہ مرے اعتبار کی باتیں

وہ ترا روٹھ کر چلے جانا
دیدۂ اشکبار کی باتیں

وہ ترا بے رخی سے ٹھکرانا
اور عارفؔ کی پیار کی باتیں

○

حسن نے سادگی کی حد کر دی
ہم نے دیدہ وری کی حد کر دی

بے بسی عیب ہے جوانی کو
عشق نے بے بسی کی حد کر دی

ہم پہ الزام بے وفائی تھا
ہم نے بھی دل لگی کی حد کر دی

یار فرزانگی سے جلتے تھے
ہم نے دیوانگی کی حد کر دی

کچھ تو ہم کو بھی دے دیا ہوتا
اے خدا! مفلسی کی حد کر دی

نوریانِ فلک بھی حیراں ہیں
خاک نے سرکشی کی حد کر دی

اک گناہ پر وہ اس قدر معتوب
جس نے تھی بندگی کی حد کر دی

ہر ستم سہہ کے سر جھکا دینا
ہم نے تو عاجزی کی حد کر دی

دوستی میں نہ کیا کیا عارفؔ
اُس نے بیگانگی کی حد کر دی

○

جگ سے ناتا توڑ رہا ہے
دل کا ناتا جوڑ رہا ہے

پتھر لوگوں کی بستی میں
اپنے سر کو پھوڑ رہا ہے

مے خواروں کے اس جھمگھٹ میں
دل ہے کہ انموڑ رہا ہے

دیکھو ، دیکھو اے فرزانو!
دنیا کوئی چھوڑ رہا ہے

مجبوروں کی نگری نگری
دل دیوانہ دوڑ رہا ہے

اب تک جانے کیوں زندہ ہے
رسموں کا رخ موڑ رہا ہے

کون سنے گا اس پگلے کی
پتھر کو جھنجھوڑ رہا ہے

جائیں کس نگری میں ساجن
سکھ یاں بھی بے اوڑ رہا ہے

تو بھی بک جا سستے داموں
لمحہ لمحہ ہوڑ رہا ہے

عارفؔ تو جی دیوانہ تھا
وہ دیکھو دم توڑ رہا ہے

○

کتابِ وفا میں فسانے ہیں میرے
وہ یادوں کے سارے خزانے ہیں میرے

سبھی، عمرِ رفتہ کے ایام تیرے
وہ عہد وفا کے زمانے ہیں میرے

شگفتہ شگفتہ سی باتیں ہیں تیری
بڑے غم بھرے سے ترانے ہیں میرے

یہ شعر و سخن ، قہقہے ، یہ فسانے
تمہیں سوچنے کے بہانے ہیں میرے

اگرچہ بہت لوگ نالاں ہیں مجھ سے
بہت لوگ پھر بھی دوانے ہیں میرے

چمن پھونک ڈالو تو شاید جلاؤ
کہ ہر ڈال پر آشیانے ہیں میرے

میں یارو تمہیں کیا بتاؤں ٹھکانا
کہ لمبے سفر ہی ٹھکانے ہیں میرے
حقیقت سرِ عام جب کھولی عارفؔ
وہ بل کھا کے بولے نشانے ہیں میرے

○

جو اب مشہور ہوتے جا رہے ہیں
خدا سے دور ہوتے جا رہے ہیں

ذرا اسلاف سی غیرت ہے جن میں
غموں سے چور ہوتے جا رہے ہیں

جنہیں خونِ جگر ہم نے پلایا
بڑے مغرور ہوتے جا رہے ہیں

سنا ہے بے صداؤں کے سفینے
بطرفِ طور ہوتے جا رہے ہیں

ہمیں ہی پھر اذاں دینا پڑے گی
کہ ہم رنجور ہوتے جا رہے ہیں

نکل کر صبح دم گھر سے پرندے
بڑے مسرور ہوتے جا رہے ہیں

نکلنا ہی پڑے گا پھر وطن سے
بہت مجبور ہوتے جا رہے ہیں

ہواؤں میں نمی سے کہہ رہی ہے
گلے منظور ہوتے جا رہے ہیں

عدو مجھ کو سنا کر کہہ رہا تھا
وہ اب تو حور ہوتے جا رہے ہیں

شرابِ بے بسی کا بھی مزا ہے
جو ہم مخمور ہوتے جا رہے ہیں

جوانی کے تھے ایسے زخم عارفؔ
جو اب ناسور ہوتے جا رہے ہیں

○

جو یادوں کا کوئی پرتَو نہیں ہے
اُسے کیسے بلاؤں جو نہیں ہے

میں کیسے معتبر ہوتا کہ مجھ میں
وہ جو کچھ ڈھونڈتا تھا سو نہیں ہے

ابھی کچا ہے میرا ، اُس کا رشتہ
ابھی کچھ حوصلہ دل کو نہیں ہے

تمہارا غیر سے ملنا اے جانم!
حقیقت ہے کوئی کنسو نہیں ہے

تیری قیمت تو اَٹی بھی نہیں ہے
کہ تو عارفؔ ہے یوسف تو نہیں ہے

○

جیون کے سفر کے کیا کہنے ، ہر خواب سہانا لگتا ہے
یوں ہم نے عمر گزاری ہے ، اب ایک فسانہ لگتا ہے

جسم بھی کافی تھک سا گیا ، اور جان بھی بوڑھی لگتی ہے
ہنستے بستے شہروں میں ، گاؤں یہ پرانا لگتا ہے

سرشاری میں ڈوب گئے ، میخوار گو ساری محفل کے
تُو میرے ظرف کو کیا جانے ، ساقی انجانا لگتا ہے

کچھ بھولی بسری باتیں ہیں ، کچھ یادوں کی سوغاتیں ہیں
اور ایسی باتیں کہنے میں ، تُو ایک زمانہ لگتا ہے

خوشبو ہے دھیمی سی ، اور نرم و نازک چاپ بھی ہے
مایوس ہو کیوں اب اٹھ بیٹھو ، ان کا ہی آنا لگتا ہے

جب سندیسے آ جاتے ہیں ، تو سب کو جانا پڑتا ہے
اب تیری باری لگتی ہے ، تیرا بھی جانا لگتا ہے

ہم رشتوں کی زنجیروں میں ، یوں جکڑے ہوئے مجبور سے ہیں
اب قدریں بھول گئیں عارفؔ ، بس ساتھ نبھانا لگتا ہے

حصہ نظم

O
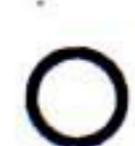
سنو کہ درد کی اک داستاں سناتا ہوں
یہ زخم دل کے سر عام میں دکھاتا ہوں

عجیب حال ہے یارو میرا محبت میں
نہ کھل کے روتا ہوں نہ کھل کے مسکراتا ہوں

بیاد بھائی اعجاز

آیا وہ اس ادا سے کہ مہماں نہ کر سکے
آمد پہ اُس کی گھر میں چراغاں نہ کر سکے

کیا کیا نہ حشر دل میں اُٹھے رنج و کرب کے
ہم کج ادا تو غم بھی نمایاں نہ کر سکے

اوروں نے اپنے دل کا دھواں عام کر دیا
ہم اپنے ساتھ سب کو پریشان نہ کر سکے

رستے میں کھو گئے تھے دُعاؤں کے قافلے
ایسا نہیں تھا کام کہ یزداں نہ کر سکے

وہ اتنا باوفا تھا کہ جاں سے گزر گیا
ہم اُس کے غم کو اپنا غمِ جاں نہ کر سکے

وہ ایسا باادب تھا کہ کچھ بھی نہ کہہ سکا
ہم ایسے تنگ دست ، کچھ آساں نہ کر سکے

وہ ہم کو چھوڑ جائے گا یہ سوچ بھی نہ تھی
ہم گور چشم ، چشم کو گریاں نہ کر سکے

وہ اپنے دل کی بات کو دل میں ہی لے گیا
ہم کچھ بھی اُس کے درد کا درماں نہ کر سکے

اک غم رہے گا ساتھ ہمارے تمام عمر
اک شمعِ زندگی کو فروزاں نہ کر سکے

اے آسمان! حیف ہے اتنی کیا دشمنی
ہم دل کو چار دن بھی شاداں نہ کر سکے

عارفؔ ہمارے دل کی تو دل میں ہی رہ گئی
ہم اپنے غمستان کو عریاں نہ کر سکے

آہ! بھائی اعجاز

بھولنا چاہو تو یہ اور سوا ہوتے ہیں
غم کہاں اہلِ محبت سے جدا ہوتے ہیں

اُس نے تو عہدِ وفا توڑ دیا ، چھوڑ دیا
ہم گماں میں ہیں کہ ہم اہلِ وفا ہوتے ہیں

جان جاتے تو کہیں اور لے جاتے اُس کو
اُن دیاروں میں جہاں دستِ شفا ہوتے ہیں

ناتا ہی توڑ لیا ، دنیا سے منہ موڑ لیا
اپنے پیاروں سے بھلا یوں بھی خفا ہوتے ہیں؟

اے خدا ہم تیرے سیہ کار سے بندے ہی سہی
تو بتا تیرے سوا اور خدا ہوتے ہیں؟

اتنی مجبور سی دنیا میں بھلا کیا جینا
ایسے جیون میں تو لمحے بھی سزا ہوتے ہیں

اپنی شوریدہ سری چھوڑ کے سوچو عارف
ایسے کچھ حرف کہ جو حرفِ دعا ہوتے ہیں

پس منظر کی کھوج

ہر شے تلاش میں ہے چاہے کوئی کہیں ہو
ہوں آسماں کے تارے یا اپنی یہ زمین ہو
وہ چاند ہو فلک کا کہ حسین چاندنی ہو

یہ چاند اور سورج یہ آسماں کے تارے
کس کی تلاش میں ہیں قدرت کے یہ نظارے

چوں چوں کی یہ صدائیں جانے کسے پکاریں
کوئل کی کوک ہے یا بھٹکے ہوئے کی دھاڑیں
بلبل چمن میں بھٹکیں پت جھڑ ہو یا بہاریں

یہ تتلیاں بھلا کیوں خود کو سنوارتی ہیں
یہ مختلف صدائیں کس کو پکارتی ہیں

یہ آسماں پہ ہر سو اُمڈی ہوئی گھٹائیں
یہ کوند بجلیوں کی اور تیز یہ ہوائیں
بادل کی بے کسی کی ساری ہیں یہ ادائیں
ہے کونسی مصیبت گریاں ہیں جس پہ بادل
کوئی تو ان سے پوچھے کوئی بنے تو عادل
ساگروں کا پانی کس کی تلاش میں ہے
دریاؤں کی روانی کس کی تلاش میں ہے
جھونکوں کی بے مکانی کس کی تلاش میں ہے
وہ کون سی ہے ہستی جسے ڈھونڈتا ہے پانی
جھونکوں کی بے مکانی ، دریاؤں کی جوانی

بے بسی

غیروں سے ہم بوقتِ ملاقات کیا کہیں
وہ پوچھتے ہیں دیس کے حالات کیا کہیں

میرے وطن میں کیا ہے یہ دھڑمڑ مچی ہوئی
کیا ہو رہی ہے واں پہ خرافات کیا کہیں

پوچھا جو غیر نے تو یوں دل سے دھواں اُٹھا
کیا کچھ ہیں اہلِ دیس کے جذبات کیا کہیں

غیروں کا حکم جاری ہے کیوں دیس میں میرے
بکتے ہیں کیوں ، وہ کون ہیں بدذات کیا کہیں

گر میں نہیں تو پھر یہ وطن بھی ہے بے امان
چھوٹے سے منہ سے اتنی بڑی بات کیا کہیں

قابض رہے ہیں وطن پر اکثر دراز دست
اب بھی وہی ہے کالی سیاہ رات کیا کہیں

عارفؔ جہاں پہ جرم ہو سچائیوں کی رسم
بولیں تو کس طرح سے حق بات کیا کہیں

ایک خط کے جواب میں

مجھے محبوب کا نامہ ملا ہے
کوئی شکوہ ہے اُس میں نہ گلا ہے
میرا بس اس میں اتنا تذکرہ ہے
کہ مجھ کو بیوفا اُس نے کہا ہے
پھر اگلے چند فقروں میں وہ خوباں
اپنی خوبیاں گنوا رہا ہے
اور اُن میں اس طرح اُس دلربا نے
کچھ اپنے حسن کا نقشہ دیا ہے
کہ بس معلوم ہوتا ہے یہ مجھ کو
وہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہے
پھر آگے چل کے اس ظالم کے خط میں
قصیدہ سا وفاؤں کا بھرا ہے
کیا ہے تذکرہ یوں دِلرُبا نے
جفا کا دیوتا مجھ کو کہا ہے

ہیں کچھ تو ہجر کے صدموں کی باتیں
کچھ اُس کی بے کلی کا ماجرا ہے
پھر آگے چل کے یوں لہجہ ہے اس کا
وہی جیسے محبت کا خدا ہے
میں اک بے وفا آوارہ خو ہوں
جو مطلب کو ہی سب کچھ جانتا ہے
سدا زندہ رہو ہنستے رہو تم
دُعا بھی اہتماماً دے رہا ہے

اسے میں نے بھی اک نامہ لکھا ہے
فقط میں نے اسے اتنا کہا ہے
سرِ تسلیمِ خم ہے جانِ جاناں
یہ سب کچھ ٹھیک ہی تو نے کہا ہے
تیری ساری ہی باتوں کے میں صدقے
مگر آخر میں یہ کیا لکھ دیا ہے
تجھے اے کاش ظالم علم ہوتا
یہ کتنی خوبصورت بددعا ہے
اجازت ہو تو کچھ باتیں میں کہہ دوں
کہ اس دل میں دھواں سے بھر گیا ہے

نہیں ہے کوئی بھی خوبی جو مجھ میں
تو پھر دل مجھ کو کیونکر دے دیا ہے
جو کی ہیں ہجر کے صدموں کی باتیں
میرا دل بھی تو ان سے آشنا ہے
نہیں کچھ بھی تو میں نے تجھ سے چھینا
تو کیوں کر مطلبی تو نے کہا ہے
یہ دیواریں جو راہ میں آ گئی ہیں
بتا یہ میں نے ہی سب کچھ کیا ہے؟
ملیں دو دل رہیں وہ پیار میں گم
زمانہ کب یہ سب کچھ مانتا ہے
جو دو دن ہنس کے تیرے ساتھ گزرے
وہ ہنسنا اس قدر مہنگا پڑا ہے
میرے اپنے بھی مجھ سے چھٹ گئے ہیں
تیرا عارفؔ تو خود سے کھو گیا ہے
تجھے معلوم ہو کیوں کر او ظالم
تیرا دیوانہ کیوں کر جل بجھا ہے
بھٹکتا ہوں تمہاری جستجو میں
مجھے آوارہ تو گردانتا ہے

تیرا زخمی تیرا آوارہ قیدی
زمانے بھر میں تجھ کو ڈھونڈتا ہے
ہیں تیرے پیار کی ساری سوغاتیں
وگرنہ زندگی کو روگ کیا ہے
اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ ڈالوں
بہت لمبا غموں کا سلسلہ ہے
مگر پھر سوچتا ہوں فائدہ کیا
کہاں تو دردِ دل سے آشنا ہے
کوئی جئے مرے تیری بلا سے
تجھے تو فقط خود سے واسطہ ہے
حصارِ ذات سے نکلو تو دیکھو
کہ ہر اِک آدمی ٹوٹا پڑا ہے
غموں کو سہہ کے بھی ہنستے ہی رہنا
تُو اس کو اتنا آساں جانتا ہے؟
ہنسانے کے لئے میں دوسروں کو
خود اتنے کرب سے گزرا ہوں جانی
کہ اب رونا بھی چاہوں رو نہ پاؤں
تماشا بن گئی ہے زندگانی

سفر

ہم چلتے رہے اور چلتے رہے
چہروں کو تکتے چلتے رہے
جیون کی راہ میں ہر لمحہ
جیتے بھی رہے اور مرتے رہے
روتے بھی رہے ہنستے بھی رہے
ہم چلتے رہے ہم چلتے رہے
کچھ زندہ دل ایسے بھی ملے
جو محفل میں تو ہنستے رہے
پر رات ڈھلے کسی کٹیا میں
چھپ چھپ کر آہیں بھرتے رہے
ہم دیکھ کے اُن کو ہنستے رہے
ہم چلتے رہے ہم چلتے رہے

کچھ راہ میں موتی ایسے ملے
جو چمک دمک سے ہیرے تھے
جو پرکھا تو پتّھر نکلے
ہم پھینک کے اُن کو چلتے رہے
چہروں کو تکتے چلتے رہے
ہم چلتے رہے ہم چلتے رہے

کچھ دل والے نادان یہاں
الہامی باتیں کرتے رہے
ان اندھیاروں کی نگری میں
بس شمع کی مانند جلتے رہے
ہم سنتے رہے اور تکتے رہے
ہم چلتے رہے ہم چلتے رہے

اس سفرِ مسلسل میں یارو
کچھ ایسے لوگ بھی ملتے رہے
جو کہتے تھے دل والے ہیں
پر دل کا سودا کرتے رہے
وہ دیکھ کے ہم کو ہنستے رہے
ہم چلتے رہے ہم چلتے رہے

اے دل!

رات بھر یوں ملول رہتا ہوں
جیسے دریائے غم میں بہتا ہوں

تو بھی تو روٹھ روٹھ جاتا ہے
روز غم کے تھپیڑے سہتا ہوں

خوفِ سکوت

سکوتِ ذات سے ہوں اس قدر سہا کہ خواہش ہے
کہیں پہ آگ لگ جائے کہیں ہنگامہ ہو جائے

نہیں خوشیوں کا کچھ سامان بنتا ہے تو رہنے دو
مرے چارہ گرو! درد و الم کا جامہ ہو جائے

ارضِ وطن

اے میری جان میری ارضِ وطن
تجھ پہ میں جان کو بھی واروں گا
اپنے خوں کو بناؤں گا غازہ
میں تیرے حسن کو نکھاروں گا

اے میری خاکِ پاک ارضِ وطن
تجھ میں اک شہرِ بے نوا سا ہے
اور اس شہرِ بے نوا میں بھی
ایک ہستی عظیم رہتی ہے

لوگ کہتے ہیں میری ماں ہے وہ
سچ تو یہ ہے کہ میری جاں ہے وہ

میں وہ سرکش ہوں جس کے اُٹھّے قدم
ہر قدم پر ستم اُٹھاتے ہیں
ایسے طوفان جب گزر جائیں
لوگ برسوں ہی بین پاتے ہیں

اے میری جان میری ارضِ وطن
تیری اس خاک کا ہر اک ذرہ
میری ماں کی اماں میں ہو جیسے
میری جاں کی اماں میں ہے اے وطن

اے میری جان میری ارضِ وطن
تو مجھے اس لئے بھی پیاری ہے

میں نے سوچا نہیں تھا یہ جاناں

تیری آنکھوں میں بے رخی ہوگی
اتنی بے مہر زندگی ہوگی
میرے جلنے پہ بھی او بے پرواہ
تیری آنکھوں میں تیرگی ہوگی
اس قدر بھی تو بے خبر ہوگی
میں نے سوچا نہیں تھا یہ جاناں

وقت اتنا مجھے ستائے گا
ہر قدم پر مجھے رُلائے گا
ساتھ تیرا بھی چھوٹ جائے گا
اور تو یاد اتنا آئے گا
یاد ہی میری زندگی ہوگی
میں نے سوچا نہیں تھا یہ جاناں

کہہ دے کہہ دے یہ میرا دھوکا ہے
یہ زمانہ بھی سارا جھوٹا ہے
تو نے تو خوب آبیاری کی
پیار کا پیڑ خود ہی سوکھا ہے
اتنی جھوٹی تیری زباں ہوگی
میں نے سوچا نہیں تھا یہ جاناں

بھیک میں پیار کی نہ مانگوں گا
یوں میں گھٹ گھٹ کے مر نہیں سکتا
جانتی ہو یہ میری عادت ہے
ٹوٹ سکتا ہوں ہر نہیں سکتا
پھر بھی تو مجھ سے دور تر ہوگی
میں نے سوچا نہیں تھا یہ جاناں

ناتمام

خونِ دل کام جو آئے اگر اے میرے ندیم
میں تیرے شہر کی گلیوں میں اُجالے کر دوں

دل میں ہے اور بھی جینے کی جو خواہش عارفؔ
آ تجھے شہرِ حوادث کے حوالے کر دوں

خود کلامی

زمانے والے کھڑے تلملاتے رہتے ہیں
انہیں یہ غم ہے کہ ہم مسکراتے رہتے ہیں

غموں کی بھیڑ میں ہی مسکرا کے جینا ہے
یہ غم تو ایسے ہی سب کو ستاتے رہتے ہیں

معرکۂ عقل و دل

کل شب دل و دماغ میں اک معرکہ ہوا
بس اک ذرا سی بات پر جھگڑا کھڑا ہوا
دراصل کل دماغ نے اِترا کے تھا کہا
سُن اے میرے عزیز، اے خوابوں کے بادشاہ
اہلِ دماغ کا یہی حتمی ہے فیصلہ
وہ حصہ کاٹ دو جو ناسور بن گیا
اے کاش تم کو عقل بھی ہوتی پیارے دل
اس بے وفا کو پہلی ہی فرصت میں چھوڑتا
یہ میں ہوں جس کے کہنے پہ چل کے اے عزیز
قوموں کو اس جہاں میں بڑا مرتبہ ملا
جو بھی عظیم شخص ملے گا تمہیں یہاں
وہ میرے فیصلوں پر ہی کاربند ہوا

دل

دل نے کہا کہ ٹھہر جا اے پاسبانِ عقل
"تم نے کبھی بھی عشق کا ساغر نہیں پیا"
کوئی اک مثال دے مجھے دانش کے زور پر
کس کو خلیلِ ربّ کا یہاں مرتبہ ملا
وہ میرا فیصلہ تھا کہ جس کی تائید میں
اللہ نے تھا آگ کو گلزار کر دیا
کیا اسماعیلؑ نے بھی تیری ہی راہ پر
اپنے سر عزیز کو مقتل میں رکھ دیا
یہ بھی بتا کہ وہ تھا بھلا کس کا فیصلہ
یوسفؑ نے جب کسی کا تھا دامن جھٹک دیا
ایوبؑ تا ابد کی منور مثال ہیں
کیا ان کو بھی تمہیں نے کوئی مشورہ دیا

کیا تو تھا جس کے کہنے پہ دانش کے دیوتا؟
اویسؓ نے مٹایا مدینے کا فاصلہ
دانش کے سب ستون تو ساکت کھڑے رہے
منصورؒ کس کے کہنے پہ سولی تھا چڑھ گیا
تیرے جو پیروکار تھے بس دیکھتے رہے
تھا کون جس نے خوں سے سجایا ہے کربلا
اللہ نے تا ابد اُسے ملعون کر دیا
شیطان نے دماغ سے جب فیصلہ کیا

دماغ

رک رک میرے عزیز ، ذرا کو ٹھہر تو جا
جذبات نے ہمیشہ ہی نقصان ہے کیا
کس نے خلیلؑ کو تھی خدا کی دلیل دی
کس نے انہیں یقین دیا حوصلہ دیا
اسمٰعیلؑ جانتے تھے یہ عقل و ہوش سے
کہ موت کا تو وقت ہے مولیٰ نے لکھ دیا

تیری تو پیروکار زلیخا تھی میری جاں
یوسفؑ نے عقل و ہوش سے ہی کام تھا لیا
صبرِ ایوبؑ کی جو تو نے مثال دی
واللہ یہ کدھر سے کہاں پر ہے جا پڑا
وہ جانتے تھے بات یہ عقل و شعور سے
مولیٰ انہیں ہر آن برابر ہے دیکھتا
خالق کی جو رضا ہو بس ہے وہی رضا
صبرِ ایوبؑ کا ہے فقط اتنا فلسفہ
واہ واہ کہ تو نے ذکرِ اویسِ قرن کیا
کیسا خدا نے ذہنِ رسا اُن کو تھا دیا
اُس نے اُسی کو اپنا محبوب چن لیا
خالق تھا اپنی جونسی تخلیق پہ فدا
منصورؒ جانتا تھا حقیقت کو اس لیے
اپنی نفی سے حق کا اثبات کر گیا
کیا تو سمجھ رہا ہے کہ حضرت حسینؓ نے
جذبات اور دل سے تھا فیصلہ کیا؟
نہ نہ میرے عزیز، یہ تہمت شدید ہے
انہوں نے اپنے دین کو رسوا نہیں کیا

بس ایک جاں کے خوف سے فاسق ہو کیوں قبول
وہ سوچ کر گئے سوئے دشتِ کربلا
خالق کے آگے سر کو اُٹھانا دلیل ہے
ابلیس نے بھی دل سے ہی تھا فیصلہ کیا
کوئی مثال اور ہے تو سامنے تو لا
غصہ ہے بات بات تیری ناک پر دھرا

دل

رک جا میرے تو ہمدمِ دیرینہ سن ذرا
کیا تھا کہ تونے چرب زبانی سے کیا کیا
لیکن ذرا سا سوچ کے یہ تو مجھے بتا
آدمؑ کو کیوں خدا نے تھا پیدا بھلا کیا
سجدوں کو بے شمار خلق اُس کے پاس تھی
تخلیقِ کائنات کا کیوں فیصلہ ہوا؟
دراصل اُس کا پیار تھا یہ اپنے یار سے
مدت سے جس کا نور تھا روشن کیا ہوا

لاکھوں رسول بھیجے کہ خلقت ہو آشنا
جو آ رہا تھا رب کو محبوب تھا بڑا
پھر دوریوں کے صدمے یزداں نہ سہہ سکا
جبریلؑ بھیج کر انہیں مہماں بنا لیا
گویا کہ کائنات بھی عاشق کا کھیل ہے
تو نے کبھی بھی عشق کا ساغر نہیں پیا

دماغ

رک کر یہاں ذرا مجھے اک بات تو بتا
فردوس میں بھلا تھا آدمؑ کو کیا ہوا
تو ہی تو تھا اکیلا پریشان و بے قرار
پھر تیرے واسطے ہی عجب فیصلہ ہوا
یہ تو تھا جس کی دل لگی و مان کے لئے
حوّا کو ٹیڑھی پسلی سے پیدا کیا گیا
پھر یوں ہوا کہ ساری ہی اُلجھن یہیں ہوئی
یہ مرحلہ فساد کی جڑ ہی تو بن گیا

انسان کتنا خوش تھا بہشتِ بریں تھا گھر
حوّا جو آ گئی تو یہی در بدر ہوا
آدم نے ساری بات جو حوا کی مان لی
تیری عنائتوں سے وہ بھی ڈسا گیا
وہ تو تھا جس کی سعیِ طہارت کے واسطے
نبیوں کی محنتوں کا نیا سلسلہ چلا
میں نے کہا یہی ہے صدق و صفا کی راہ
اس راہ پہ چل پڑا جو وہ صدیق بن گیا
جب تک تھا تیرے زیرِ اثر عام سا ہی تھا
جب سوچنے لگا تو وہ فاروقؓ بن گیا
پھر جو بھی کہہ دیا وہی قانون بن گیا
وہ فکر سے قرآن کی روح تک پہنچ گیا
اکثر تو اس کی سوچ کے اس اجتہاد پر
قرآن اُس کی باتوں کی تائید کر گیا
سن اے میرے رفیق ذرا غور سے تو سُن
مالک نے تیری روک کو پیدا مجھے کیا
اب جو بھی فیصلہ ہو مجھے اپنے ساتھ رکھ
پھر کام آئے گا تیرا جذبہ و ولولہ

دل

رک جا تجھے بتاتا ہوں اک میں پتے کی بات
وہ بات جس پہ کوئی بھی قائل نہ کرسکا
قوموں کی زندگی میں وہ مرحلے بھی ہیں
اک ، دو کا اور تین کا جھگڑا نہیں رہا
چاہے ہے خود خدا کہ ہو سرفراز حق
گنتی کے یہ شمار نہیں کوئی دیکھتا
سر بچ گیا تو ٹھیک ہے ورنہ شہید ہے
دیں بچ گیا تو سمجھ لو سب کچھ ہی بچ گیا
میں کس طرح سے کیسے تیری بات مان لوں
تیرا تو پہلا خوف تحفظ ہے جان کا

اِک ندا

خالق نے جو بھی کہہ دیا ، بس وہ ٹھیک ہے
اس ٹھیک میں ہی ٹھیک ہے باتوں کا سلسلہ

تقدیر جو بھی ہے سرِ محضر لکھی ہوئی
ہو کر رہے گا جو بھی خدا نے ہے لکھ دیا

ہو کوئی بھی یاں سارے ہی مجبورِ محض ہیں
پھر میں کا اور تو کا کہاں سلسلہ رہا

بہتر ہے سب کے واسطے رب کو کریں وہ یاد
حق ہے کہ ایک ذات ہے بس حق کی راہنما

مرشد

میں اُس کے پیار کو پاؤں گا
اور دنیا کو ٹھکراؤں گا

گر وقت جدا کر دے گا ہمیں
میں یاد کی لو بھڑکاؤں گا

جب صبر کا ساغر چھلکے گا
ہر ظلم سے ہی ٹکراؤں گا

سو خوف ہیں بیٹھے رستے میں
میں یار کے در پر جاؤں گا

جب ساتھ نہ دے گا یار میرا
تو خود کو تنہا پاؤں گا

اس وقت کے گمراہ لمحوں کو
اک نور سے میں نہلاؤں گا

اک نوری چہرہ کھینچے گا
میں اُس سے پیت لگاؤں گا

وہ بولیں گے او دیوانے
میں تم کو راہ دکھاؤں گا

اب عشقِ حقیقی میں کھو کر
میں دنیا کو ٹھکراؤں گا

پاکستان......ایک آمر کی نظر میں

سب سے پہلے میری شان
بعد میں سارا پاکستان

میاں شیاں باہر پھینکو
بگتی شگتی مار ہی ڈالو
چودھری مودھری بے ایمان

سب سے پہلے میری شان
بعد میں سارا پاکستان

جو بھی بولے اندر ڈالو
اُس کے ماضی کو کھنگالو
مل جائیں گے کچھ تو نشان

سب سے پہلے میری آن
بعد میں سارا پاکستان

بیٹی میٹی کچھ نہ دیکھو
بُرقعہ مُرقعہ کچھ نہ چھوڑو
سب کر دو مجھ پر قربان
سب سے پہلے میری جان
بعد میں سارا پاکستان

میڈیا شیڈیا بند کرو جی
یا اس کو پابند کرو جی
کرتا ہے مجھ کو ہلکان
پہلے رکھیں میرا مان
بعد میں سارا پاکستان

وانا شانا کیا ہے یہ
رونا رانا کیا ہے یہ
بھون کے رکھ دو سب انسان
بے شک سب کی لے لو جان
میں ہوں سارا پاکستان

بی بی شیبی آنے دو جی
حکم ملا ہے کچھ نہ کہو جی
یاں بھی تو ہیں بے ایمان
سب کا میں ہوں حکمران
بھاڑ میں جائے پاکستان

جمہوریت چھوڑ بھی ڈالو
آئین شائن توڑ ہی ڈالو
بس رکھو اتنی پہچان
میں ہی رہوں گا بس ہر آن
بھاڑ میں جائے پاکستان

ایم ایم اے کا مقصد کیا ہے
اب لیگوں کی وقعت کیا ہے
وکلا شکلا بھی قربان
میں امریکہ کا دربان
جب تک بھی ہے جان میں جان

بزم کی کتب

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف/مرتب	اشاعتی نمبر	سنہ اشاعت
1)	سسی مولا شاہ	میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-09-03	1980
2)	چوہلاں (انشائیے)	میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-08-5	1985
3)	ٹوہاں (مجموعہ کلام)	میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-07-7	1988-95
4)	لکیں لکیں آ گیا (کافیاں مولا شاہؒ)	میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-06-9	1987-95
5)	نوائے منظر (مجموعہ کلام)	میاں محمد اسمٰعیل منظر/ میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-05-0	1988-90-96
6)	گفت گفتار (سی حرفیاں سائیں مولا شاہؒ)	میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-04-2	1988-95
7)	پھر کھیاں رُتاں (بارہ ماہیا سائیں مولا شاہؒ)	میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-03-4	1988-96
8)	تحفہ حجاز دا (تنویر بخاری)	میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-02-6	1990
9)	باتوں باتوں میں (اردو انشائیہ)	میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-01-8	1990
10)	باتوں میں باتیں (اردو انشائیہ)	میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-00-X	1991
11)	سائیں مولا شاہؒ دا قصہ بگا مل بشنو	میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-10-7	1992
12)	بول حیدری (سائیں حیدر شاہؒ دی حیاتی تے شاعری)	میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-12-7	1993
13)	النبی الکریم ﷺ (سیرت ایوارڈ یافتہ)	میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-15-8	1999
14)	نام عالی تیرا ﷺ (نعتاں)	میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-17-4	2000-01
15)	میں وچ میں (کافیاں۔محمد شریف)	میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-14-X	2002
16)	شجرہ نوشاہیاں مع باراں امام	سائیں عبدالعزیز	ISBN-969-8082-20-4	2003
17)	مرزا صاحباں (ص۔336) (ایوارڈ یافتہ)	سائیں مولا شاہؒ/ میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-21-2	2004
18)	ست گنج آرسی نامہ مولا شاہ عرف زہرہ مشتری (اردو ترجمہ)	سائیں مولا شاہؒ/ ڈاکٹر میاں ظفر مقبول	ISBN-969-8082-23-9	2007
19)	مرزا صاحباں (ص۔448) (اردو ترجمہ)	سائیں مولا شاہؒ/ ڈاکٹر میاں ظفر مقبول	ISBN-978-969-8082-26-0	2007
20)	سسی پنوں (اردو ترجمہ)	سائیں مولا شاہؒ/ ڈاکٹر میاں ظفر مقبول	ISBN-978-969-8082-22-0	2008
21)	بگامل بشنوں (اردو ترجمہ)	سائیں مولا شاہؒ/ ڈاکٹر میاں ظفر مقبول	ISBN-978-969-8082-28-4	2008
22)	بات سے باتیں	پروفیسر میاں مقبول احمد	ISBN-978-969-8082-25-0	2008
23)	مکاشفہ (غزلاں)	تنویر بخاری	ISBN-978-969-8082-29-1	2008
24)	وساں (نظماں، غزلاں)	ڈاکٹر عظمت اللہ عظمت	ISBN-978-969-8082-27-7	2008
25)	ویراں پڑے ہیں راستے	جاوید عارف	ISBN-978-969-8082-32-1	2009
26)	روگ اولڑا	چاچا محمد یوسف		2009
27)	نعتاں دا میکل	ڈاکٹر حفیظ احمد		2009

دُعا

مجھ کو توفیق ملے احمدِ مرسلؐ کے طفیل
ایسی توفیق سے سجدے بھی ادا ہوتے ہیں

پروفیسر ابوالاعجاز حفیظ صدیقی اور اقبال صلاح الدین
کی صحبت میں بیٹھنے والے جاوید عارف عرصہ دراز
سے شاعری فرما رہے تھے۔ بارہا ان کی توجہ اس
جانب مبذول کروائی گئی کہ آپ اپنی شاعری کو کتابی
شکل دیں مگر موصوف کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر
ادھر اُدھر ہو جاتے تھے۔
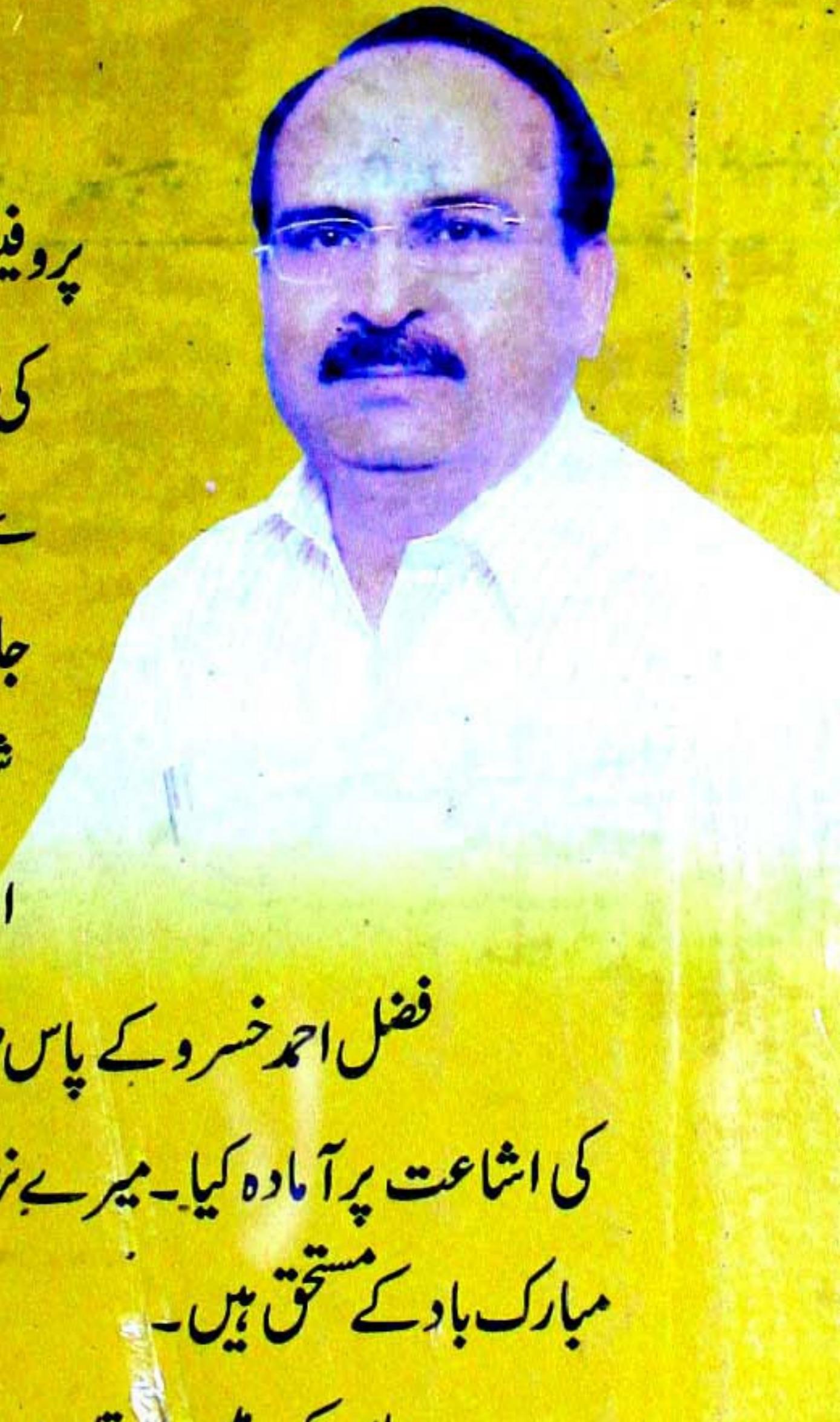
فضل احمد خسرو کے پاس ضرور کوئی نہ کوئی گُر ہے جنہوں نے انہیں کتاب
کی اشاعت پر آمادہ کیا۔ میرے نزدیک صاحبِ کتاب سے زیادہ صاحب مشورہ
مبارک باد کے مستحق ہیں۔

جہاں تک میں جانتا ہوں جاوید عارف پر کبھی بھی کٹھن وقت نہیں گزرا بلکہ
انہوں نے دوسروں کو کٹھالی میں ڈال دینے والی زندگی بسر کی ہے۔ انہوں نے
گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اور ہر گھاٹ ہر مسئلہ کو کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے اور
یہی مشاہدہ ان کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے۔

ان کی شاعری میں تغزل، علاقائی ردھم، کلام کی پختگی، نت نئی ردیفیں
دوسرے شاعروں سے منفرد نظر آتے ہیں۔ مجھے امیدِ کامل ہے کہ ان کی شاعری
قارئین کی توجہ کا مرکز بنے گی اور یہ انہیں زندہ و جاوید رکھے گی۔

ڈاکٹر میاں ظفر مقبول

ISBN: 978-969-8082-32-1
9 789698 082321